ذوق

۱

سرپرست
مشتاق عاجز

سید نصرت بخاری
ارشد سیماب ملک
حسین امجد

ذوق
اٹک

کتابی سلسلہ 1

سرپرست

مشتاق عاجزؔ

مدیرِ اعلیٰ
سید نصرت بخاری

مدیر
ارشد سیماب ملک

معاون مدیر
حسین امجد

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

ضابطہ:

کتابی سلسلہ: ذوق

تاریخ اشاعت: جنوری 2019ء

صفحات: 176

قیمت: 300 روپے

ناشر: ذوق پبلی کیشنز، اٹک

برائے خط کتابت:

سید نصرت بخاری (0322-5016121)

کامرہ کلاں، تحصیل و ضلع اٹک، snusratbuukhari@hotmail.com

ارشد سیماب ملک (0331-5130899)

النور پلازہ بالمقابل گلی الائیڈ بنک، اٹک شہر

malikarshadak@yahoo.com

فہرست

اداریہ (1)

جنوری 2019 ادبی رسالے" ذوق" کا سالِ اشاعت ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کے سامنے سرخ رو ہونے کی ایک کوشش ہے۔" ذوق" کی اشاعت کی پس منظر میں نمود و نمایش کی تمنا مطلق کارفرما نہیں بلکہ یہ ادب کی تاریخ میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کی سعی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ شعر، افسانہ، تحقیق و تنقید خود نمائی کے ذاتی اور انفرادی قرینے ہیں؛ جب کہ ادبی اخبارات و رسائل کی اشاعت ذاتیات سے بالاتر اجتماعی نوعیت کی سرگرمی ہے؛ اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ اس سرگرمی کی مثال مشعل جیسی ہے۔ ایک آدھ مشعل کا جلتے رہنا بہت ضروری ہے۔ اس سے آنے والوں کو تاریکی میں اپنی سمت متعین کرنے میں آسانی رہتی ہے۔" ذوق" کی اشاعت سود و زیاں کے خیالات اور خدشات سے بالاتر بھی ہے۔ یہ ایک احساسِ ذمہ داری کا نام ہے۔ ذمہ داری کی یہ مشعل ہمیں کسی نے دی نہیں؛ ہم نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر خود تھام لیا ہے۔ یہ کام حکومتی اداروں کا ہے لیکن جب تک حکومتی اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر ذمہ دار اور دانش ور متمکن نہیں ہوں گے، حکومتی اداروں سے ادبی اخبارات و رسائل کی اشاعت کی توقع رکھنا نادانی ہے۔ اس صورتِ حال میں شکوۂ ظلمت کے ساتھ ساتھ ہم سب پر اپنے حصے کی مشعل جلانا بھی فرض ہے۔ ہمیں یقین ہے جب ہمارا سفر اختتام پذیر ہوگا تو کوئی ہمارے جیسا ذمہ دار آگے بڑھ کر اس مشعل کو تھام لے گا؛ چاہے اس مشعل کا کوئی بھی نام ہو۔ ایک آدھ مشعل کا جلتے رہنا ضروری ہے۔ مالی وسائل کی عدم دستیابی رسائل کی بندش کی ایک بڑی وجہ ہے لیکن غیر معیاری تخلیقات کی اشاعت بھی کسی رسالے کے بندش کا سبب ہوسکتی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم معیار پر کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔ ہمیں اچھوتے موضوعات پر اشعار، افسانے، مضامین اور مقالے بھیجیے۔ ہم آپ کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے منتظر ہیں۔

مدیر اعلیٰ: سید نصرت بخاری

اداریہ (2)

برصغیر پاک و ہند میں اردو کے رسائل و جرائد کی اشاعت کو کم و بیش دو سو سال ہوئے ہیں۔اس عرصہ میں بے شمار رسائل و جرائد صحافتی افق پر نمودار ہوئے اور ہندوستانی معاشرت پر مذہبی ،سماجی ،سیاسی اور علمی و ادبی لحاظ سے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔ 1857ء کی جنگِ آزادی ہو تحریکِ علیگڑھ، تقسیمِ ہند یا دیگر ادبی تحریکیں رسائل وجرائد نے ہر دور میں کلیدی کردار ادا کیا ہے ۔یہ اپنے عہد کی نمائیدگی کرتے ہیں اور تاریخ اور تحقیق نگاری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مستند اردو صحافت کا تذکرہ کیا جائے تو ''جامِ جہاں نما'' کو ہی اردو پہلا اخبار تصور کیا جاتا ہے اگر چہ کہ بعض مورخین کے مطابق اردو صحافت کا آغاز اس سے قبل ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں ماسٹر رام چندر نے ''فوائدالناظرین'' اور ''محب ہند'' میں فلسفہ اور جدید علوم وفنون پر مفید مضامین شائع کر کے اردو جریدہ نگاری کو فروغ دیا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی سے قبل مولوی محمد باقر ایسے نڈر اور بیباک محب وطن نے قوم پرستی اور صحافتی اقدار کی جو بنیاد رکھی اس کی مثال نہیں ملتی ۔ان اقدار کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سید محمد ،سر سید احمد خان، مولانا ظفر علی خان ،مولانا محمد علی جوہر ،مولانا ابو الکلام آزاد ،مولانا حسرت موہانی مولانا عبدالمجید سالک مونا محمد حسین آزاد، ایسے اہل علم و دانش نے گراں مایہ خدمات انجام دیں۔اس کے بعد سے اردو رسائل و جرائد کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے علم و ادب کی آبیاری کی اور نئے دبستان قائم کیے اور ادب کے معیارات کا تعین کیا۔سر سید احمد خان کے تہذیب و اخلاق ،مولانا آزاد کا لسان الصادق ،سر عبدا القادر کا مخزن ،خواجہ غلام الثقلین کا عصر جدید ،راشد الخیری کا عصمت ،سید امتیاز کا کہکشاں ،شاہد دہلوی کا ساقی ،نوبت رائے نظر کا ادیب اور ان جیسے بے شمار رسائل و جرائد نے بیسویں صدی سے رواں صدی تک اردو کی ترقی و ترویج اور علم و ادب کی آبیاری میں کوشاں رہے۔ایک طویل قطار ہے ان گوہرِ نایاب کی جنہوں نے جدو جہدِ آزادی ،کلاسکیت ،رومانیت ،

وجودیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت ایسی تحریکوں کے رجحانات کی ترجمانی کرتے ہوئے ادبی اور صحافتی سطح پر کردار ادا کیا تاہم ان تمام ادوار میں رسائل جرائد کو ہمیشہ سے مالی وسائل ایسی مشکلات کا سامنا رہا۔ اگرچہ کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدت کاری نے ذرائع ابلاغ کی ترسیل کو سہل بنا دیا ہے مگر اس برق رفتار ٹیکنالوجی میں سانس لینے کے لیے پرنٹ میڈیا بالخصوص ادبی رسائل و جرائد کے چیلنجز کو اور بڑھا دیا ہے۔ دورِ اولین سے آج تک اردو کے منظر نامے پر بے شمار رسائل و جرائد جلوہ افروز ہوئے لیکن وسائل کی عدم دستیابی کی نظر ہو گئے۔ راقم الحروف کو اس قبل ایسے ہی تجربے سے سہ ماہی ''قندیل'' کی صورت گزرنا پڑا۔ اس جریدے نے بہت مختصر وقت میں معتبر ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا کر معیاری ادب کے فروغ کی نمائندگی کرتے ہوئے نذر صابری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نثار اکبر آبادی، پرتو روحیلہ، اکبر حمیدی، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، منشا یاد، محمد حمید شاہد، شبنم رومانی اور ان ایسے معتبر قلمکاروں کو اپنے حلقہ نگارش میں شامل کر لیا تھا تاہم یہ جریدہ بھی وسائل کی عدم دستیابی کی نظر ہو گیا۔ اب ایک نئے عزم کے ساتھ جناب مشتاق عاجز کی سرپرستی اور سید نصرت بخاری کی ہمرائی میں ''ذوق'' پیش خدمت ہے۔ یہ پرچہ خالصتاً ادبی نظریات کا حامل اور معیاری ادب کا ترجمان ہے۔ اس کی پہلی اشاعت میں ہم کس حد تک کامیاب یا ناکام ٹھہرے اس کے لیے آپ کی قیمتی آرا کے منتظر ہیں اور ساتھ ہی یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے معیار کو بہتر و برقرار اور اسے زندہ رکھنا آپ ایسے علم و دانش کا کام ہے۔

مدیر: ارشد سیماب ملک

فاضل میسوری

قبولِ حق کا بیاں لا الہ الا اللہ　　فلاح و فوز کی جاں لا الہ الا اللہ
ہے بے نشاں کا نشاں لا الہ الا اللہ　　خودی کا سرّ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

مسیحِ جامعِ تکریم کی تلاش میں ہے　　کلیمِ صاحبِ تکلیم کی تلاش میں ہے
ذبیحِ پیکرِ تسلیم کی تلاش میں ہے　　یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

نہیں مقیدِ مے، نشہ کا نہیں پابند　　بوقتِ حزن کسی نوحہ کا نہیں پابند
کسی کہانی کسی قصہ کا نہیں پابند　　یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

فتورِ عقل کا فسق و فجور کا سودا　　بلاشبہ ہے یہ تیرے قصور کا سودا
نہیں یہ سودا کمالِ شعور کا سودا　　کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الہ الا اللہ

اگر بگڑتے ہیں لوگ اس پہ تو بگڑ جائیں　　تقاضا کرتی ہیں مجھ سے یہ دین کی قدریں
صدائیں حق و صداقت کی چار سو گونجیں　　اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

یہ تخت و تاج یہ لشکر یہ تیرا قصرِ بلند　　یہ کہکشاؤں سے تیرا گزر یہ مہ پہ کمند
یہی سبب ہیں جو دیتے ہیں تیرے دل کو گزند　　یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم وگماں لا الہ الا اللہ

فروغِ عشق میں آتی ہے اس سے دشواری — یہی سکھاتی ہے انساں کو دجل ومکاری

بہت ضروری ہے اس حیلہ جو سے بیزاری — خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

ستیہ پال آنند

نعت

دھیان میں گُم

اے شہنشاہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسوہء حسنہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بندہ، ستیہ پال آنند

غیر مسلم ضرور ہے، لیکن

یہ اجازت تو دیں مجھے سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دھیان میں گم، زمیں کو بوسہ دوں

اور باقی کی عمر، اے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یونہی ٹھہرا رہوں، جھکائے ہوئے

درِ شاہ اُمم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ سر اپنا

دھیان میں گم رہوں تو شاید میں

دیکھ پاؤں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جلوہ

چہرہء پاک کی ضیا پاشی

کالی کملی سے نور چھنتا ہوا

دھیان میں گم رہوں تو سن پاؤں

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں پیامِ حق کے راز

جاوداں زندگی کی تعبیریں

لفظ "وحدت" کے معنی و تفسیر

تھوڑی ہی عمر رہ گئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کلمہ خواں اپنا سر جھکائے ہوئے

اور دستِ طلب بڑھائے ہوئے

منتظر آپ کی شفاعت کا

ارضِ طیبہ پہ میں تنِ تنہا

دھیان میں گم کھڑا ہوا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ہندوام، کافرم، گنہ گارم

طاہر اسیر

نعت

یوں اُنؐ کے در پہ شعر کہا احتیاط سے
جیسے کوئی جلائے دیا احتیاط سے
چہرے پہ مَل رہا ہوں درِ مصطفٰے کی خاک
اے چشمِ اشک بار! ذرا احتیاط سے
پیراہنِ رسولؐ سے خوش بو کشید کی
پھولوں نے کیسا کام لیا احتیاط سے
دامن میں کل جہان کی نرمی سمیٹ کر
دستِ صبا نے اُن کو چھوا احتیاط سے
اتنا تو اُنؐ کی یاد میں تڑپا کہ ایک بار
گھبرا کے میں نے دل سے کہا احتیاط سے

خورشید ربانی

غزل

دیوار سمجھتی ہے کہ در کو نہیں معلوم
جو دکھ ہے دریچے کا وہ گھر کو نہیں معلوم

وہ روز مرے ساتھ سفر کرتی ہے لیکن
اسبابِ سفر راہ گزر کو نہیں معلوم

دیوار گہہِ خواب میں در کیسے بنے گا
یہ کام ہے دل کا سو نظر کو نہیں معلوم

کیوں موجِ ہوا شہر میں آوارہ پھرے ہے
یہ بات کسی شاخِ شجر کو، نہیں معلوم

توقیر ہے اک لفظ مگر اس کے معانی
دستار کو معلوم ہیں سر کو نہیں معلوم

سرگرم ہے کس کس کا لہو ان کے بدن میں
اخبار کی سرخی کو خبر کو نہیں معلوم

کیوں شام و سحر پھرتا ہوں میں اُس کی گلی میں
خورشید مرے رشکِ قمر کو نہیں معلوم

کاشف غائر

غزل

جو خاک اُڑانے کو بس مشغلہ سمجھتا ہے
یہ راستہ اُسے دل سے بُرا سمجھتا ہے

میں آدمی ہوں مرا بولنا ضروری ہے
کہ خامشی کی زباں بس خدا سمجھتا ہے

جو رو رہا ہے مجھے اُس سے کچھ غرض ہی نہیں
جو ہنس رہا ہے وہی دُکھ مرا سمجھتا ہے

مُحال ہوتا ہے اُس آدمی کو سمجھانا
وہ آدمی کہ جو اچھا بُرا سمجھتا ہے

یہ لوگ اب بھی مجھے اجنبی پُکارتے ہیں
یہ شہر اب بھی مجھے گاوں کا سمجھتا ہے

سوار ہے وہ یہاں دوسرے کے کاندھوں پر
جو اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے

ہمی وہ لوگ ہیں جو انقلاب لاتے ہیں
تُو خواب دیکھنے والوں کو کیا سمجھتا ہے؟

وقار احمد آس

غزل

موسمِ ہجر اگر ٹھہر گیا میرے بعد
مجھ کو ترسے گا ترا شہرِ انا میرے بعد

اب کوئی چیخ نہ نالہ نہ کوئی درد کی لہر
کتنی سنسان ہے مقتل کی فضا میرے بعد

قتل کرنا ہے تو پھر شوق سے کر دو لیکن
لوگ مانگیں گے مرا خون بہا میرے بعد

ذکر چھڑ جائے گا جب میری وفا کا اک دن
مجھ کو روئیں گے سبھی اہلِ وفا میرے بعد

چاند منظر، نہ اُجالا، نہ دھنک رنگ کوئی
آس ! خوابوں نے کیا حشر بپا میرے بعد

شاہین فصیح ربانی

غزل

یہ انساں یا ہیولے پھر رہے ہیں
ہم ان کے بیچ سہمے پھر رہے ہیں
ہوئی ہے مایوس زندگی خود سے
گلی میں چند کتے پھر رہے ہیں
مرا ساماں برآمد اب نہ ہو گا
سپاہی چور اکٹھے پھر رہے ہیں
شکاری آ گیا بے رحم کوئی
پرندے بین کرتے پھر رہے ہیں
تغیر وقت کا دیکھا نہیں ہے
اکیلے تھے ،اکیلے پھر رہے ہیں
فتور آیا ہے شاید نیتوں میں
نگاہیں اور چہرے پھر رہے ہیں
کوئی تعبیر امکاں میں نہیں ہے
مگر ہم خوب چنتے پھر رہے ہیں

پروفیسر نثار احمد

غزل

دل نگری میں شور نہیں ہے

اس جنگل میں مور نہیں ہے

تھوڑا تھوڑا عشق ہے تجھ سے

اتنا بھی منہ زور نہیں ہے

کچھ تو مجھ میں ٹوٹ رہا ہے

یوں ہی اتنا شور نہیں ہے

حاکم، منصف اور محافظ

کون یہاں پر چور نہیں ہے

یارو! سچ سے اچھا کیا ہے

لیکن سچ کا دور نہیں ہے

ثقلین انجم

غزل

کہیں پہ خاک اُڑتی ہے، کہیں صحرا اتر آیا
تمہارے بعد آنکھوں میں کوئی دریا اتر آیا

کوئی پاتال سے جاگی ہوئی خوشبو بلاتی تھی
فرازِشوق پر میں تھا بڑا تنہا ،اتر آیا

سوادِ درد میں رہنا مری فطرت میں شامل تھا
خوشی پا کر طبیعت میں تکدّر سا اتر آیا

گلابی ادھ کھلے ہونٹوں پہ شبنم رقص کرتی تھی
گھنی پلکوں کے سائے میں سمندر تھا اتر آیا

بوقتِ وصل شانوں پر ملائم دودھیا آنچل
سنبھالا تھا بہت اُس نے مگر پھِسلا اتر آیا

گئے لمحوں کی چلمن کو ہٹایا تو کھُلا ہم پر

ہمارے بخت پر وحشت کا اِک سایہ اتر آیا

O

حسین امجد

غزل

بدن میں خوئے انگڑائی بہت ہے
ہوا نے زلف بکھرائی بہت ہے

ہجومِ شہر سے اُکتا گیا ہوں
مرے جینے کو تنہائی بہت ہے

میں خود کو، اچھی طرح جانتا ہوں
مری خود سے شناسائی بہت ہے

میں تیرا عکس آنکھوں میں بسا لوں
مجھے تھوڑی سی بینائی بہت ہے

اندھیری رات اور لمبی مسافت
اکیلی جان گھبرائی بہت ہے

اسے میں ورغلا سکتا ہوں امجد

مگر ایسے میں رسوائی بہت ہے

O

مشتاق عاجزؔ

چلو افسانہ لکھتے ہیں

چلو افسانہ لکھتے ہیں
اسی میں وصل کا منظر
رسیلی گفتگو
شکوے، گلے
قسمیں، ارادے اور
پھر ملنے
ہمیشہ کے لیے ملنے کے وعدے
لکھ کے
دونوں دل کو بہلاتے
ملن کے گیت گاتے ہیں
چلو خوابوں، خیالوں ہی میں
اپنے پیار کی دنیا بساتے ہیں
چلو افسانہ لکھتے ہیں

کہ افسانے میں
سچائی بھی لکھ دیں تو
سماجی، مذہبی اقدار کے راکھے
خوشی سے سن بھی لیتے ہیں
کسی کمرے، کسی حجرے میں
چھپ کے پڑھ بھی لیتے ہیں
نہ تقریروں نہ جلسوں میں
نہ اپنے خاص خطبوں ہی میں
اس پر بات کرتے ہیں

افتخار بخاری

چڑیوں کے نام

چڑیوں! میرے باغ میں آنا
میں رکھوں گا
ایک کنالی میں کچھ اجلا پانی
اک تھالی میں دانہ
چڑیو! آنا
تم کو دیکھ کے جی لیتا ہوں
صبحیں میٹھی ہو جاتی ہیں
شامیں بھی اچھی لگتی ہیں
جب تم پنکھ ہلاتی ہو
اللہ حافظ کہتی ہو
آتی رہنا، کل بھی آنا
میں بچوں سے کہہ دوں گا
میری قبر پہ میرے بچے رکھیں گے
ایک کنالی میں پانی اک تھالی میں دانہ
چڑیو!

اچھا ہے نا

لگا رہے یہ تک آنا جانا

ڈاکٹر سعادت سعید

قلبِ ماہیت

(مشرقی پاکستان کے سانحے پر لکھی نظم)

تمہارے سائے مری تمنا کے جنگلوں میں بھٹک گئے ہیں

ابھی ہواؤں کی آستینوں میں

خواہشوں کے کنول دھڑک کر

ہر اک شے کو

غبارِ باراں کی ٹھنڈکوں کو لباس دیں گے

ابھی تمہارے نقوشِ نگراں میں

ریت ہوتے مسافروں کے حواس پھیلیں گے سایہ سایہ

سمندروں سے بھی گہری آنکھیں پلک پلک پر

اداس خوشبو کے آئینوں میں

سکوتِ آتش ابل پڑے گا

میں زیرِ لب خامشی میں کھوئے

حروفِ بیدار جانتا ہوں

جہان تیرہ میں

کرنیں چننے کی آرزو میں
لرزتی شاخوں کا ریزہ ریزہ
فنا کی موجوں میں بہہ گیا ہے
یہ میں ہوں جس نے تمہارے ماتھے پہ ہونٹ رکھ کر
تمہارے پورے بدن کی سرخی ذخیرہ کر لی
یہ میں ہوں جس نے تمہارے لفظوں کی سرد جھلیں
مہیب شعلوں کو سونپ دی ہیں
یہ میں ہوں جس کی رگوں نے پھیلے مہین شیشے
تمہارے سانسوں میں حل کیے ہیں
گلے میں بکھرے ستارے
رخسار چھلنی!!

راشد ملک

رفوگر

یہاں سے بھی وہاں سے بھی
ادھر سے بھی ادھر سے بھی

ذرا سا اس طرف نیچے
یہاں تھوڑا سا اوپر بھی

بتاؤں کیا تجھے اس کا
ہر اک جانب سے ادھڑا ہے

رفوگر یہ مرا دل ہے
مرے سینے کا ٹکڑا ہے

اسے چاروں طرف سے ہو سکے تو ہو بہ ہو کر دے
یہاں کچھ بیتے لمحوں کی کئی رنگین یادیں ہیں

کئی معصوم چہرے ہیں

کئی دل چسپ وعدے ہیں کئی بے درد رہتے ہیں
اور اُن سے آج تک جتنے ملے وہ درد رہتے ہیں

یہاں تنہائیوں کی میٹھی میٹھی آگ جلتی تھی
یہاں اس سے ملن کی حسرتِ ناکام پلتی تھی

یہاں کونے میں رکھی ہیں کئی ناکامیاں میں نے
جلائی ہیں یہاں چھپ کر کئی بدنامیاں میں نے

یہاں پر اک زمانہ تھا وفا کے دیپ جلتے تھے
مزاجِ مثلِ یاراں ہر گھڑی موسم بدلتے تھے

یہاں پر خواب ٹوٹے تھے مرے احباب جھوٹے تھے
یہاں تقدیر کے سب فیصلے بھی مجھ سے روٹھے تھے

رفوگر یہ جگہ زخموں سے چھلنی ہے، بہت زیادہ
توجہ اس جگہ پر تم نے کرنی ہے، بہت زیادہ

یہ دل ان مول ہے میرا
بتا کیا مول ہے تیرا

کوئی اپنے ہنر کا معجزہ ہی آج تو کر دے
مرے ٹوٹے ہوئے دل کو رفوگر تو رفو کر دے

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد

حکیم محمد یوسف حضروی اور اُن کا سفر نامہ سیرِ سوات

پنجاب کے شمال مغرب میں آباد ضلع اٹک کا ایک زرخیز علاقہ ''چھچھ'' اپنی زرخیزی اور مردم خیزی کے اعتبار سے دُور ونزدیک میں مشہور ہے۔اس علاقے کو قدیم زمانے میں ''چھکشا'' یا ''شکشا''(Chhuksha) کہا جاتا تھا اور یہ ٹیکسلا کی راج دھانی کا ایک صوبہ تھا۔(۱) معروف چینی سیّاح فاہیان نے اپنے سفر نامے میں جس علاقے کو سرشاساہزرہ (Shirshasa Hasra) کہا ہے ،اس میں سرشاسا ،چھچھ اور ہزرہ ہزارہ کے لیے مستعمل ہے۔(۲) چھچھ اور ہزارہ کا نام جغرافیائی قُرب اور تہذیبی سانجھ کے باعث اکثر اکٹھا لیا جاتا رہا ہے۔ایک قدیم دوہا جو مغل شہنشاہ نورالدین جہاں گیر سے منسوب ہے،اس میں گندم کی بہترین پیداوار کے لیے چھچھ ہزارہ کا نام اکٹھا لیا گیا ہے،دوہا یوں ہے:

چھچھ ہزارے کنکاں چنگیاں ، دھنی کھوب گائیں
سور سیکرتی گھوڑ بھلے ، ہشت نگر کے دھائیں (۳)

چھچھ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں متعدد روایات ملتی ہیں، جیسے:

الف: ''چھچھ کی ظاہری صورت چھاج سے مشابہہ ہے،اس لیے اسے چھاج،چھج کہا جاتا تھا جو رفتہ رفتہ چھچھ بن گیا۔

ب: سندھ کے حکمران راجا داہر کے باپ کا نام راجا چچ تھا،اس نام کی مناسبت سے اس علاقے کا نام چھچھ پڑا۔

ج: بعض روایات کے مطابق چھچھ کا لفظ شش،شاس، چاچ، چھگ، چھب یا چھاپ کی مبدل صورت ہے۔

د: چھچھ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دلدلی زمین کے ہیں۔اس علاقے کو یہ نام سکندرِ اعظم نے دیا۔

ان روایات میں مؤخر الذکر زیادہ قرینِ قیاس ہے کیوں کہ دریائے سندھ کی قربت کے باعث چھچھ کی بیش تر زمین دلدلی ہے۔(۴)

چھچھ کا علاقہ شرقاً غرباً ۱۹ میل (لمبائی میں) اور شمالاً جنوباً ۸ میل (چوڑائی میں) پھیلا ہوا ہے۔جغرافیائی طور پر یہ خطہ ۲۷-۱۹ سے ۲۷-۵۳ درجے طول بلد شرقی اور ۳۳-۵۰ سے ۳۳-۵۹ درجے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے۔چھچھ کے شمال میں دریائے سندھ، جنوب میں جرنیلی سڑک، مغرب میں اٹک بنارس کی پہاڑیاں اور مشرق میں گندگر پہاڑ ہے جو اسے ہزارہ سے جُدا کرتا ہے۔چوراسی دیہات پر مشتمل اس علاقے کا مرکزی قصبہ حضرو ہے۔خواجہ محمد خان اسدؔ کے بہ قول:

''چھچھ کا پُرانا نام 'چھچھ چوراسی' ہے کیوں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس کے چوراسی دیہات تھے۔''(۵)

چھچھ کی زمین زرخیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔دریائے سندھ کی قربت کے باعث یہاں گندم، مکئی، گنا، تمباکو اور چنے کی فصلیں اور مختلف سبزیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں جو اپنے ذائقے اور معیار کے اعتبار سے دورو نزدیک میں شہرت رکھتی ہیں۔منشی امین چند ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے سفرنامے میں اس خطے کی زرخیزی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''علاقہ چھچھ ایک ہموار میدان ہے۔ پیداواری میں بڑا کامل اور زمین وہاں کی اکثر چاہی ہے بل کہ تمام ضلع (اُس وقت یہ علاقہ راول پنڈی کے ضلعے میں شامل تھا) میں اس علاقے کے برابر دوسرا کوئی علاقہ اچھا نہیں ہے۔ باقی تمام ضلع میں یا تو پہاڑ ہے یا نشیب و فراز ہے، غرض کہ

اس چھچھ کے برابر کوئی کوئی مسطح قطعہ میدان کا نہیں اور یہاں کی ایک نقل مشہور ہے، وہ یہ ہے: چھچھ ماں سمندر کی جو مانگے سو لے۔''(٦)

جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) اور دریائے سندھ کے درمیان آباد چھچھ کا یہ زرخیز علاقہ تاریخی، تہذیبی اور علمی حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ علاقہ یونانیوں سے لے کر افغانیوں تک اکثر حملہ آوروں اور طالع آزماؤں کی گذرگاہ رہا ہے۔ کئی خوں ریز معرکے اور جنگیں اس دھرتی پر لڑی گئیں۔ ١٠٠٨ء میں سلطان محمود غزنوی اور راجا انند پال کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ چھچھ کے میدان میں ہوا، جس میں انند پال کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں یہ خطہ خاص طور پر مرکزِ نگاہ رہا۔ اکبرِ اعظم نے ١٥٨١ء میں دریائے سندھ پر ایک عظیم الشان قلعہ بنوایا تاکہ افغانوں کی شورش کو کچلا جا سکے۔ عہدِ اورنگ زیب عالم گیر میں کامل خان قلعہ دار اٹک اور نقلی شاہ شجاع کے درمیان ١١٧٧ھ میں ہارون (علاقہ چھچھ) کے مقام پر خوں ریز لڑائی لڑی گئی۔ میدان کامل خان کے ہاتھ رہا اور نقلی شاہ شجاع اور اس کے بہت سے ساتھی تہ تیغ ہوئے، بچ کر بھاگنے والے دریائے سندھ کی تیز لہروں کی نذر ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ١٨١٣ء میں سکھوں اور افغانوں کے درمیان ایک بڑی لڑائی لڑی گئی جو ''جنگِ اٹک'' کے نام سے مشہور ہے۔ سیّد احمد شہید اور سکھوں کے درمیان کئی جھڑپیں بھی اسی علاقہ میں برپا ہوئیں۔ اس علاقے سے ملنے والے آثارِ قدیمہ سے اس کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔ چھچھ کے علاقے سے ملنے والے دو تاریخی کتبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتبے خروشتی رسم الخط میں ہیں۔ پہلا کتبہ گڑھی متنی سے جب کہ دوسرا کامرہ سے دست یاب ہوا۔ کامرہ سے ملنے والا کتبہ کنشکِ دوم [کنشکا] کی پیدائش سے متعلق ہے۔

علمی اعتبار سے بھی اس خطے کو عزت و توقیر حاصل ہے۔ اس خاک سے ایسے مردانِ خدا اُٹھے جن کے تبحرِ علمی نے ایک عالم کو مستنیر کیا۔ چھچھ کے قریے قریے میں دینی

مدارس کی داغ بیل ڈال کر ان مردانِ خدا نے پورے عالم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دور دراز سے تشنگانِ علم یہاں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہو کر قرآن و حدیث کی روشنی سے قلوب واذہان کو منور کرتے رہے۔ یہ علاقہ اسی علم وفضل کے باعث ہندوستان کا بخارا کہلاتا رہا۔ ماضی قریب کے اکابر علمائے گرامی میں مولانا عبدالرحمان کامل پوری، مولانا قطب الدین غورغشتوی، شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی، مفتی محمد عمر شمس آبادی، مولانا عبدالغنی، مولانا قاضی غلام جیلانی شمس آبادی، مولانا زاہد الحسینی، قاضی محمد انوار الحق، مولانا محمد یوسف اور مولانا غلام اللہ خان شامل ہیں۔ اس خطے نے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی قدآور اور ممتاز شخصیات کو جنم دیا۔ بھائی بالک سنگھ جنھیں سکھوں کا گیارہواں گُرو کہا جاتا ہے، اسی خطے کے فرزند تھے۔ نام دھاری اور نرنکاری فرقے کے پیشوا کی حیثیت سے انھیں مسندِ تکریم عطا ہوئی۔ نامور گائیک استاد اعجاز حسین حضروی، ماسٹر کفایت حسین حضروی اور نوازش حضروی کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ خواجہ محمد خان اسد، حکیم تائب رضوی، منظور عارف، احمد داؤد، احمد جاوید، مشتاق عاجز، مرزا حامد بیگ جیسے شعر وادب کے ممتاز ستارے اسی خاک سے طلوع ہوئے۔ سیرِ سوات کے مصنف حکیم محمد یوسف حضروی کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔

[۲]

حکیم محمد یوسف کا تعلق حضرو کے معروف علی زئی قبیلے سے تھا۔ اُن کی بعض تصانیف جیسے: **الطبیب والحکیم، جنگِ رجیع، اسرارِ باہ** وغیرہ میں اُن کے نام کے ساتھ سیّد لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے بادی النظر میں ان کا تعلق سادات گھرانے سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ بات درست نہیں۔ کتابوں پر نام کے ساتھ سیّد کا اضافہ غالباً محض تکریم اور عزت کے لیے کیا گیا ہے، چوں کہ یہ کتابیں خود حکیم صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئیں، اس لیے یہ کہنا کہ ایسا سہواً ہوا ہوگا، درست نہیں۔ یہ اضافہ ارادتاً کیا گیا ہے تاہم حکیم صاحب کی دوسری کتابوں اور

خطوں بل کہ لیٹر پیڈ پر بھی یہ اضافہ دکھائی نہیں دیتا۔ حکیم محمد یوسف کے جد کلاں محمد احمد جو ''بابو جی'' کے نام سے معروف تھے، اطرافِ غزنی سے ہجرت کر کے آئے اور علاقہ چھچھ کو اپنا مستقر ٹھہرایا۔ وہ زراعت پیشہ تھے اور عالم بھی۔ دورانِ قلبہ رانی کھیت کے کناروں پر بیٹھے ہوئے طالب علموں کو درس بھی دیتے جاتے تھے۔ ان کا مزار حضرو کی مشہور مسجد ''کھجور والی'' میں ہے۔ سکندر خان نے اپنی کتاب دامنِ اباسین میں حکیم یوسف کے بھائی سلیمان خان کے ایک خط کا ذکر کیا ہے، جو ان کے مطابق ۱۸۹۰ء میں حکیم یوسف حضروی کو کلکتہ بھیجا گیا، اس میں اُن کے خاندان کے بعض احوال اور غزنی سے چھچھ ہجرت کی تفصیل مرقوم تھی۔ (۷) سکندر خان کا یہ کہنا کہ ۱۸۹۰ء میں حکیم صاحب کو ان کے بھائی نے خاندانی حالات سے متعلق خط لکھا، درست نہیں۔ یہ خط ۱۹۱۴ء میں لکھا گیا ہوگا کیوں کہ طبی کمیٹی دہلی و لاہور نے کسی اشاعتی منصوبے کے لیے حکیم صاحب سے ان کے خاندانی احوال طلب کیے تھے۔ حکیم صاحب نے اس سلسلے میں اپنے بھائی کو جو خط لکھا، وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''از دفتر

عین الحسن اکسیری دواخانہ

اسمٰعیل مدن لین نمبر ۲۲، کلکتہ

۳رمئی ۱۹۱۴ء

بخدمت شریف جناب بھائی صاحب، السلام علیکم۔

پہلے ایک لفافہ خدمت شریف میں روانہ کر چکا ہوں، امید ہے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ اس اثنا میں آپ کا ایک کارڈ بھی آیا۔ فی الحال ایک اچانک [کذا] اموراتِ ذیل سے مطلع کیجیے:

۱۔ ہمارے خاندان میں کہاں سے لوگ یہاں آ کر سکونت پذیر

ہوئے ہیں؟

۲۔اوران کے اسمائے گرامی کیا تھے؟

۳۔دُنیاوی زندگی اوروسائلِ آمدنی کیا تھے؟

۴۔اوروالدصاحب تک سلسلہ بہ سلسلہ اُن لوگوں کے نام۔

۵۔اُن لوگوں میں کون کون شخص عالم،فقیر،درویش،کامل،صاحبِ دل گزرے ہیں؟

۶۔اوران سے کوئی کرامات یاولایت زندگی میں یابعدازوفات ظہور میں آئی ہوں،وہ واقعات یاتذکرہ مختصرلفظوں میں۔

۷۔اس ملک میں آنے پرکسی زمانہ[زمانے]کے بادشاہوں سے ربط ضبط یاکوئی تعلق رہاہو،اُس کاتذکرہ۔

۸۔حضروبابااورحضرواورحضروخیل میں نسبتِ لفظی،اُس کی پوری تشریح۔

۹۔حضروباباکے مزارکے پاس طوفانِ اباسین کانہ آنایاوہ واقعات کہ مزار کی گھاس،بخاروالاہاتھ پراُس کوباندھےتوبخارجاتارہے،کہاں تک صحیح ہیں؟یابچوں کی آنکھ کواچھاکرنایااورکوئی خاندانی واقعہ عجیب وغریب ہوتو وہ بھی ضرورلکھیے گا،سب صحیح صحیح اورٹھیک ہوں۔یاچچاعبدالقدیرصاحب کے انتقال پرجنوں کارونااوربھی بزرگوں کے واقعات مشہورمعروف ہوں،ضرورلکھیے گااوربہت جلدجواب دے کرسرفرازکیجیے کیوں کہ طبی کمیٹی لاہورودہلی میں صحیح صحیح نسب نامہ اورجوسوال میں نے آپ کولکھے ہیں،اُس کے متعلق صحیح صحیح جواب طلب کیے ہیں۔جواب جانے پرطبی کمیٹی میں چھپ کرشائع ہوں گے۔چوں کہ یہ باتیں آپ کوہم سے

زیادہ معلوم اور موقف [کذا] ہیں جو نہیں معلوم وہ والد صاحب
وچچا صاحب ودیگر صاحبوں سے دریافت کر کے تشفی بخش جواب دے
سکتے ہیں، اس لیے فوراً تحریر فرما دیں۔ ۱۵/ مئی تک سب جوابات طبی
کانفرنس میں جائیں گے، غفلت وسستی کو راہ نہ دیں۔ فقط

محمد یوسف عفی عنہ" (۸)

حکیم محمد یوسف حضروی کے والدِ گرامی کا نام محمد حسن اور دادا کا نام محمد سعید تھا۔ آپ ۱۸۵۵ء میں حضرو میں پیدا ہوئے۔ اُن کے ابتدائی حالاتِ زندگی اور تعلیم و تربیت کے بارے میں کُچھ معلوم نہیں۔ ان میں حکمت کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ انھوں نے حکمت کی ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ انھوں نے کن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا؟ کن اداروں میں وہ زیرِ تعلیم رہے؟ ان سب سوالوں کا مستند اور تسلی بخش جواب معلوم نہیں۔ سکندر خان اپنی کتاب میں حکیم یوسف حضروی کی بابت رقم طراز ہیں:

> "آپ جامعۂ ازہر کے فارغ التحصیل تھے، دہلی کے طبیہ کالج سے حکمت کی سند لی اور کلکتہ میں ۱۹۴۷ء تک مطب چلاتے رہے۔" (۹)

حکیم محمد یوسف حضروی کی ایک تصنیف جنگِ رجیع موسومہ بہ بہادر مسلمان کے سرورق پر حکیم صاحب کے نام کے ساتھ "تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان، مدینہ منورہ و جامع [جامعہ] ازہر قاہرہ مصر" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ افغانستان، عرب اور مصر سے تعلیم حاصل کی۔ سوائے جامعۂ ازہر کے کسی ادارے یا درس گاہ کا نام معلوم نہیں کہ وہ کن اداروں میں زیرِ تعلیم رہے۔ میرے خیال کے مطابق طبیہ کالج

، دہلی سے اُن کا حکمت کی سند لینا محلِ نظر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جن دنوں حکیم محمد یوسف حضروی کلکتہ میں حکمت کرتے تھے، اُن کا طبیہ کالج، دہلی کے ساتھ مضبوط تعلق استوار ہوا اور اس ادارے کے کئی اساتذہ سے اُن کے قریبی دوستانہ مراسم بنے مگر کہیں بھی انھوں نے اپنے آپ کو اس ادارے کا تعلیم یافتہ یا سند یافتہ نہیں لکھا۔ راشد علی زئی نے قدرے مبالغے کے ساتھ اُن کے تعلیمی سفر کی بابت لکھا ہے۔ انھوں نے اگرچہ طبیہ کالج، دہلی میں اُن کی تعلیم کا واضح اشارہ نہیں کیا مگر ''ہندوستان کی مشہور و معروف درس گاہوں'' سے اُن کے کسبِ علم کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں حکمت کی تعلیم کے حوالے سے طبیہ کالج، دہلی بلاشبہ معروف ادارہ تھا، تاہم کوئی واضح شہادت ہاتھ نہیں آتی، جو حکیم صاحب کی طبیہ کالج سے وابستگی کو ظاہر کر سکے۔ راشد علی زئی ان کے علمی سفر کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''بچپن ہی سے حصولِ علم کا شوق دامن گیر ہوا تو آپ نے کم عمری میں ہی ہندوستان کی مشہور و معروف درس گاہوں کو کھنگال ڈالا مگر حصولِ علم [کذا] کی پیاس نہ بُجھ سکی تو افغانستان و خراسان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہاں سے علوم و فنون اور طب میں دسترس حاصل کرنے کے بعد علومِ عربیہ و دینیہ میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے حجاز و مصر کے مشہورِ زمانہ جامعات کا رُخ کیا اور ایک مدت تک ان ممالک میں قیام کر کے اپنے شوق کی تکمیل کی۔'' (۱۰)

راشد علی زئی نے میرے نام اپنے ایک خط میں حکیم صاحب کو دارالعلوم دیوبند کا فارغ التحصیل بھی ٹھہرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''حکیم صاحب کی پانچ بہنیں اور دو بڑے بھائی تھے۔ سب سے بڑے مولانا عبدالرحمٰن فاضلِ دیوبند تھے۔ وہ حکیم صاحب کو بارہ سال کی عمر میں اپنے ساتھ دارالعلوم دیوبند لے گئے، حکیم صاحب وہاں علوم اسلامیہ

کی تحصیل کے بعد حضرو واپس چلے آئے اور جلد ہی کابل اور حجاز و مصر کی درس گاہوں میں جا کر کسبِ فیض کیا۔"(۱۱)

دارالعلوم دیوبند سے حکیم صاحب کا تعلیم حاصل کرنا بھی محلِ نظر ہے۔ یہ محض سُنی سنائی بات ہے جسے کسی مستند شہادت اور واضح ثبوت کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دارالعلوم دیوبند کا آغاز ۳۱ر مئی ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس وقت حکیم صاحب کی عمر گیارہ سال تھی۔ راشد صاحب کے مطابق حکیم صاحب بارہ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ تحصیلِ علم کے لیے دیوبند پہنچے یعنی ۱۸۶۷ء میں، جب دارالعلوم کو قائم ہوئے ابھی محض ایک سال ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بڑے بھائی جنھیں فاضلِ دیوبند رقم کیا گیا ہے، وہ کس زمانے میں دیوبند میں تحصیلِ علم کرتے رہے؟ کیا محض ایک سال میں وہ فاضلِ دیوبند بن گئے تھے؟ پھر یہ کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستگی ایک اعزاز سے کم نہیں۔ حکیم صاحب نے اپنی تصانیف وتالیفات اور مضامین ومکاتیب میں کہیں بھی اس عظیم علمی ادارے سے اپنے کسبِ علم کا ذکر نہیں کیا۔ اگر وہ اس ادارے کے فارغ التحصیل ہوتے تو یقیناً وہ افتخار کے ساتھ اس کا کہیں نہ کہیں ذکر کرتے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ حکیم یوسف حضروی حکمت اور دوسرے متداول علوم میں اچھی خاصی دست گاہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، پشتو اور اُردو زبان سے اُن کی گہری وابستگی اور مہارت کا اندازہ ان کی تحریروں اور کتابوں سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انگریزی زبان سے بھی انھیں کچھ کچھ آشنائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ حکیم یوسف حضروی نے حضرو کے مختلف دینی مدارس سے تعلیم حاصل کی، کیوں کہ اُن دنوں علاقہ چھچھ میں جا بہ جا دینی مدارس قائم تھے، جن میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، لغت، صرف، نحو، رجال، منطق، ادب اور دوسرے شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دُور دراز کے طلبہ ان مدارس میں

کسبِ علم کے لیے آتے۔ حکیم یوسف حضروی نے علاقہ چھچھ کے مدارس سے کسبِ فیض کرنے کے بعد سوات اور دوسرے افغان علاقوں کا رخ کیا ہوگا۔ میری اس بات کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ سیرِ سوات میں انھوں نے بعض علما سے اپنے تلمذ کا اجمالی ذکر کیا ہے۔(۱۲) انھوں نے سیرِ سوات کے حصّہ دوم میں اُن کے تفصیلی حالات وواقعات بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر افسوس کہ سیرِ سوات کا دوسرا حصہ سامنے نہ آسکا اور یوں ان علما کے احوال اور حکیم صاحب کی ان سے کسبِ فیض کی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ ان علما میں توروسک کے منطقی مُلا صاحب، کانڑا کے مُلا صاحب، چکیسر کے مُلا صاحب اور ثور ہا کے ضعیف شاہ اخون زادہ صاحب شامل ہیں۔

حکیم محمد یوسف کے حجاز، مصر اور افغانستان کے علمی سفر کے حالات مکمل طور پر پردۂ تاریکی میں ہیں۔ انھوں نے ان دیار وامصار میں کتنا قیام کیا؟ کن علوم وفنون میں مہارت حاصل کی؟ اور کن اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا؟ کچھ معلوم نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے حکمت کا آغاز کہاں سے کیا؟ اور کلکتہ تک کیسے پہنچے؟ ان سوالوں کے جواب میں بھی کوئی مستند شہادت ہاتھ نہیں آتی۔ فلسفۂ شادی مطبوعہ ۱۹۴۶ء کے ابتدائیے میں حکیم محمد یوسف حضروی نے لکھا:

> ''راقم الحروف آج اپنی زندگی کی اکانوے منزلیں طے کر چُکا ہے۔ اس نوے سال میں، مَیں نے ہندوستان، افغانستان، خراسان، عربستان، حجاز اور مصر میں اپنی عمر کا ایک اچھا خاصا حصّہ صرف کیا اور تقریباً پچاس سال سے حکمت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔''(۱۳)

اس عبارت سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

اوّل: حکیم صاحب لگ بھگ چالیس سال کی عمر تک مختلف مما لک سے

کسبِ علم و حکمت کرتے رہے۔

دوم: انھوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں با قاعدہ حکمت شروع کی۔

۳ر مئی ۱۹۱۴ء میں اُن کی کلکتہ میں موجودگی اور ''عین الحسن اکسیری دواخانہ'' کے ساتھ اُن کی وابستگی کا اظہار اُن کے ایک خط سے ہوتا ہے جو پچھلے اوراق میں نقل کیا گیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس ادارے کے ساتھ ان کی وابستگی بہ طور معاون حکیم کے رہی ہوگی۔ اس ادارے کے ساتھ وہ کب وابستہ ہوئے اور کتنی دیر اس کے ساتھ منسلک رہے؟ اس کے بعد اپنا مطب قائم کرنے تک وہ کن اداروں کے ساتھ بہ طور طبیب اپنی خدمات انجام دیتے رہے؟ ''اکسیراتِ ہند'' کے نام سے کلکتہ کی کولوٹولہ اسٹریٹ میں انھوں نے اپنے ذاتی دواخانے کی بنیاد کس سال رکھی؟ ان سوالوں میں سے کسی سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کلکتہ کے ممتاز حکما میں اُن کا شمار ہوتا تھا اور شہر کی ممتاز شخصیات، حکما اور شعر و ادب سے وابستہ افراد کے ساتھ اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ طبی کانفرنسوں میں نہ صرف شریک ہوتے بل کہ مقالات بھی پیش کرتے، جو اکابر حکما کی نظر میں داد و تحسین کے سزاوار ٹھہرتے۔ آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی کے زیرِ اہتمام حیدر آباد دکن میں منعقدہ کانفرنس ۱۹۲۳ء میں ''روح کی حقیقت'' کے عنوان سے حکیم یوسف حضروی کے مقالے پر انھیں ''تمغا'' پیش کیا گیا۔ اسی طرح اُن کی محققانہ تصنیف اسرارِ باہ پر آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی کی جانب سے ۱۹۲۹ء کی طبی نمائش میں ''سند'' پیش کی گئی۔ حکیم محمد یوسف حضروی بنگال کی جنرل کونسل اینڈ اسٹیٹ فیکلٹی آف یونانی میڈیسنز کے ممبر بھی رہے اور مختلف ریاستوں کے شاہی طبیب بھی۔ نامی گرامی رؤسا اور نوابین کے معالجِ خاص ہونے کی وجہ سے دُور و نزدیک میں اُنھیں عزت حاصل تھی۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں کلکتہ سے ایک ماہ وار طبی رسالے شفا کا اجرا کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مصور طبی رسالہ تھا۔ یہ

رسالہ کتنا عرصہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا، معلوم نہیں۔ راقم کی نظر سے شفا کا محض ایک شمارہ بابت جولائی، اگست ۱۹۲۶ء گزرا ہے۔ رسالہ اپنے مندرجات، پیش کش اور طباعت کے اعتبار سے معیاری ہے۔ مولوی ریاست علی ندوی، حکیم غلام کبیر خان، حکیم سید ریاضت حسین، حکیم کبیر الدین اور حکیم غلام محمد ناظم کے وقیع مقالاتِ حکمت کے ساتھ خود ایڈیٹر کے چار پانچ مقالات شاملِ رسالہ ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شفا کو اپنے عہد کے ممتاز ادبا اور حکما کا تعاون حاصل رہا۔ شفا کے حوالے سے راشد علی زئی رقم طراز ہیں:

> ''کلکتہ کے اس قیام کے دوران ہی حکیم یوسف حضروی نے طب کے موضوع پر ایک منفرد اور اچھوتا ماہ نامہ شفا مارچ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا اور جب تقسیمِ ہند کے بعد آپ ۱۹۵۱ء میں کراچی آ گئے تو یہاں سے بھی شفا کا سلسلۂ اشاعت جاری رہا۔''(۱۴)

راشد علی زئی نے راقم کے نام اپنے ایک خط میں یہ انکشاف بھی کیا:

> ''حکیم محمد یوسف حضروی میرے والدِ گرامی خواجہ محمد خان اسدؔ کے رشتہ میں نانا بنتے تھے اور والدِ گرامی کی علمی دل چسپی کے پیشِ نظر ان سے خصوصی برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ۱۹۵۰ء میں کلکتہ سے ہجرت کر کے کراچی وارد ہوئے تو وہاں اپنا رسالہ شفا جاری کیا تو والدِ گرامی کو کراچی بُلا کر اس کا مدیر مقرر کر دیا مگر یہ سلسلہ چند ہی ماہ چل سکا اور والدِ محترم واپس حضرو تشریف لے آئے۔''(۱۵)

سکندر خان نے حکیم صاحب کا سالِ ہجرت ۱۹۴۷ تحریر کیا ہے۔ راشد علی زئی نے اپنے مضمون میں ۱۹۵۱ء اور میرے نام اپنے خط میں ۱۹۵۰ء تحریر کیا ہے۔ حکیم صاحب کا کلکتہ میں چوں کہ بڑا مطب تھا، اس لیے گمانِ غالب ہے کہ اس کو کو سمیٹنے میں کچھ وقت ضرور لگا ہوگا، اس لحاظ سے حکیم صاحب کا ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرنا محلِ نظر ہے۔ انھوں

نے کس سال ہجرت کی؟ اس کے بارے میں بھی کوئی مستند شہادت ہمیں دست یاب نہیں تاہم خواجہ محمد خان اسدؔ کے نام ۲۲ رمئی ۱۹۵۰ء کوانھوں نے کراچی سے ایک خط لکھا جواس بات کی دلیل ہے کہ وہ مئی ۱۹۵۰ء سے قبل کراچی آ گئے تھے۔ پاکستان میں شفا کے اجرا کی بابت بھی کوئی ٹھوس شہادت ہمارے ہاتھ نہیں لگی۔ راقم نے نامی گرامی اطبا اور حکما سے اس رسالے کی بابت استفسار کیا اور کراچی کی بڑی لائبریوں اور کتب خانوں میں بھی اسے تلاش کیا مگر اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ خواجہ محمد خان اسدؔ اپنی کتاب دوستی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں، اگر وہ کُچھ عرصہ اس رسالے کے مدیر رہے ہوتے تو اُن کے کتب خانے میں ان کے زمانۂ ادارت کے شفا کے پرچے ضرور موجود ہوتے۔

حکیم محمد یوسف حضروی نے ہجرت کے بعد کراچی کو اپنا مستقر ٹھہرایا اور وہاں اکسیراتِ حضروی دواخانے کے بنیاد رکھی۔ پیرانہ سالی میں ایک نئی جگہ پر دواخانے کو چلانا مشکل کام ہے تاہم حکیم صاحب نے جوں توں کر کے پانچ سات سال دواخانے کا سلسلہ قائم رکھا۔ وفات سے کُچھ عرصہ پہلے وہ سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے آبائی علاقے حضرو آ گئے اور یہیں ایک سو پانچ سال کی عمر میں ۸ ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ انھیں حضرو کے معروف ''بنی والے قبرستان'' میں دفن کیا گیا۔

حکیم صاحب کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ بڑے صاحب زادے کا نام محمد احسن تھا جو پیشے کے لحاظ سے انجنیئر تھے، انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ انگلینڈ میں بسر کیا اور وہیں وفات پائی۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد قاسم ہے جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے ایک طویل عرصہ انگلستان میں قیام پذیر رہ کر نومبر ۲۰۱۸ی کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ حاجی سکندر خان کے بہ قول معروف امریکن میگزین ***Who is who in the World*** نے اپنے ایک شمارے میں انھیں دُنیا کے دس بڑے ماہرینِ نفسیات میں شمار کیا ہے۔(۱۶) حکیم

محمد یوسف کی بڑی بیٹی جمیلہ بیگم کا حضرو میں بیاہ ہوا، چند سال پہلے انھوں نے حضرو سے کراچی نقلِ مکانی کی۔ دوسری بیٹی حمیدہ بیگم اقتصادیات میں ایم اے تھیں۔ وہ کراچی میں اپنے شوہر کے ساتھ ہفت روزہ **Trade Ways** سے منسلک رہیں۔(۱۷) ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اس وقت گویا حکیم محمد یوسف حضروی کی ایک بیٹی حیات ہیں۔

حکیم یوسف حضروی صفِ اوّل کے طبیب تھے۔ اُن کا شمار اپنے وقت کے اہم اطبأ میں ہوتا ہے۔ جدید انداز کے مطب کی ہمہ وقت دیکھ بھال اور ہر روز بیسیوں مریضوں کے معائینے اور علاج معالجے کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف وتالیف سے بھی غافل نہ رہے۔ انھوں نے حکمت کے مختلف موضوعات پر جو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں وہ حکمت کے ساتھ اُن کے غیر معمولی شغف کی غماز ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ کتبِ حکمت کے مطالعے اور محققانہ عرق ریزی سے کام لے کر اپنی کتابوں کو گراں بہا اور نافع بنانے کا جتن کیا ہے۔ انھی اوصاف کی بدولت اُن کی کتابوں کو طبقۂ حکمت میں وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور نامی گرامی اطبأ نے ان کی کتب کو پسندیدگی اور تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا اندازِ نگارش علمی اور ادیبانہ ہے۔ برمحل آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ، اشعار، ضرب الامثال اور اقوالِ حکما سے وہ اپنی تحریر کو سجاتے، سنوارتے اور پُرتاثیر بنانے کے ہُنر سے آگاہ تھے۔ ان کی معلوم تصانیف کا اجمال میں تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ **یونانی دوا سازی:** یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۶ء سے قبل کلکتہ سے شائع ہوئی۔ جولائی، اگست ۱۹۲۶ء کے شفا میں مطبوعہ ایک اشتہار میں حکیم یوسف حضروی کے نام کے ساتھ مصنف **یونانی دوا سازی** تحریر ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن لیتھو آرٹ پریس، کراچی سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۳۶ صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب میں یونانی دوا سازی کے معیاری طریقے درج کیے گئے ہیں۔ اسے فنِ یونانی دوا سازی کے موضوع پر پہلی کتاب

قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ تحقیقِ تپِ دق: یہ کتاب بھی ۱۹۲۶ء سے قبل منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ سِل یا تپِ دق اُس عہد کا عام مرض تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں اس مرض کی علامات اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی ہیں۔ اس کے اصولِ علاج اور مجرب نسخہ جات بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کی محققانہ عرق ریزی کا آئنہ ہے جسے قبولِ عوام وخواص کی سند حاصل ہوئی۔

۳۔ جنگِ رجیع موسومہ بہ بہادر مسلمان: رجیع کے مقام پر حضرت خبیبؓ کی شجاعت و بہادری کا واقعہ نہایت پُر درد انداز میں قلم بند ہوا ہے۔ کتاب ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب پر سالِ تصنیف و اشاعت درج نہیں تاہم ۱۹۲۶ء سے قبل اکسیراتِ ہند دواخانہ کلکتہ سے شائع ہوئی۔

۴۔ اسرارِ باہ (خورد): یہ کتاب ۱۳۴۶ھ بہ مطابق ۱۹۲۷ء اکسیراتِ ہند دواخانہ، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۲۲۰ صفحات کی اس کتاب میں موضوع کے جملہ پہلوؤں پر اجمالی بحث کی گئی ہے اور مجرب نسخہ جات اور طریقِ علاج کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ اسرارِ باہ (کلاں): اسرارِ باہ کے موضوع پر یہ اُن کی دوسری کتاب ہے جو پہلی کتاب کے مقابلے میں تقریباً چار گُنا ضخیم ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں کلکتہ سے شائع ہوا اور اس کے قبولِ عام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض ایک سال کے عرصے میں اس کی ایک ہزار جلدیں نکل گئیں۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں حکیم یوسف حضروی کی محققانہ عرق ریزی کا اظہار یہ ہے۔ اہلِ علم اور حکماء نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی نے اسے مستند کتاب قرار دیتے ہوئے سند سے نوازا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ ۱۳۵۲ھ بہ

مطابق ۱۹۳۳ء میں اشاعت آشنا ہوا۔ عربی کے پروفیسر مولانا **فضل الرحمٰن** اور حکیم محمد صادق نے اس کے قطعاتِ تاریخ رقم کیے۔ مولانا **فضل الرحمٰن** کا قطعۂ تاریخِ طباعت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مرے مہرباں یوسفِ حضروی
ہیں بے شک طبیبِ حذاقت پناہ
خدا اُن کو رکھے کہ اُن کا وجود
مریضوں پہ ہے ایک فضلِ الٰہ
انھوں نے لکھی ہے یہ نادر کتاب
جو ہے ذوقِ طبی پہ اُن کے گواہ
وہ موضوع جو زیرِ بحث اس میں ہے
بہت اس میں گہری ہے اُن کی نگاہ
ہوئی طبعِ ثانی کی تاریخ یہ
عجب کنزِ مخفیِ **اسرارِ باہ**

۱۳۵۲ھ

۶۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا: یہ کتابچہ ۱۹۳۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ **نگار** بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مشیر احمد دہلوی کے مضمون ''مرنے کے بعد کیا ہوگا'' پر نیاز فتح پوری نے ایک نوٹ تحریر کیا جس میں حیات بعد الممات یا معاد کی حقیقت سے انکار کیا گیا تھا۔ حکیم محمد یوسف حضروی نے علامہ نیاز فتح پوری کے مضامین اور تحریروں سے اُن کے انکارِ معاد کا رد پیش کیا ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ہفت روزہ **سچ** لکھنؤ بابت ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء میں مختصر تبصرہ تحریر کیا، مولانا کا یہ تبصرہ درجِ ذیل ہے:

''مرنے کے بعد کیا ہوگا: از حکیم محمد یوسف صاحب، مدیر شفا کولو ٹولہ کلکتہ۔ ۳۲ صفحے۔ غالباً مفت ملے۔ نیازؔ فتح پوری کے ایک مضمون کا دل چسپ جواب، جس میں نیازؔ نے حقیقتِ معاد سے انکار کیا تھا، زیادہ تر جوابات خود نیازؔ ہی کے اقوال سے دیے گئے ہیں۔'' (۱۸)

۷۔ **الطبیب والحکیم (خیالاتِ زریں):** یہ کتابچہ اعلیٰ حضرت نواب بہادر کیپٹن خواجہ حبیب اللہ صاحب نواب ڈھاکہ کے علومِ شرقیہ اور علمِ حکمت پر زریں خیالات یا اقوال کا حامل ہے۔ نواب موصوف کے خیالات کو حکیم محمد یوسف حضروی نے کتابچے کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ کتابچہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت بھی اکسیراتِ ہند، کلکتہ سے ہوئی۔ سالِ اشاعت درج نہیں۔

۸۔ **فلسفۂ شادی:** یہ مختصر سی کتاب زن وشو کے تعلقات اور ازدواجی زندگی کی اہمیت، شادی کی ضرورت اور اس کے تقاضوں پر نہایت آسان زبان اور عام فہم اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان میں کم عمری کی شادی اور زن وشو کے درمیان بگاڑ کے مختلف اسباب وعوامل کو عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور بہتر ازدواجی زندگی گزارنے کے اصول اور آداب بتائے گئے ہیں۔

۹۔ **سیرِ صوات (حصہ اوّل):** سیرِ سوات حکیم محمد یوسف کا سوات کا سفر نامہ ہے۔ حکیم صاحب نے سوات کو عنوانِ کتاب میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ ''صوات'' لکھا ہے۔ یہ سفر ۱۹۴۴ء کے موسمِ گرما میں ہوا۔ حکیم صاحب نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اپنے سفر کے احوال اور سوات کی تہذیب وثقافت کو اس کتاب میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ریاست کے بادشاہ، ولی عہد اور دیگر اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں اور ریاست کے انتظام اور والیانِ ریاست کے اندازِ حکمرانی پر بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ یہ سفر نامہ

زبان و بیان اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی حکیم صاحب کی دوسری کتب سے ممتاز ہے اور اس میں ان کی اُردو، فارسی اور عربی شاعری کے نمونے بہ صورتِ قصائد موجود ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں اکسیراتِ ہند، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے آخر میں اس کے حصّہ دوم کی نوید سُنائی گئی ہے مگر بعد میں **سیرِ سوات** کا حصّہ ٔ دوم شائع نہ ہوسکا۔

حکیم محمد یوسف حضروی نے اس کے علاوہ کیا کُچھ لکھا، معلوم نہیں۔ کلکتہ سے کراچی منتقلی اور پھر وہاں سے حضرو نقلِ مکانی میں شاید اُن کے مسودات اور کتابیں ضائع ہو گئی ہوں یا ان کے سامان اور کاغذات میں کہیں دبی رہ گئی ہوں، ہمیں اُن کی کُچھ خبر نہیں۔ راشد علی زئی صاحب حضرو میں ان کے عزیز و اقارب سے رابطہ کرتے رہے مگر انھیں اس ضمن میں کامیابی نہ ہوسکی۔ وہ اپنے ایک مضمون میں اپنی ناکامی کا ذکر قدرے درشت انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

> ’’افسوس! حکیم حضرویؒ کے بے شمار مقالاتِ نظم ونثر [کذا] اور طبی نسخہ جات کے ساتھ ساتھ کئی مسودات اور دوسری چیزیں اُن کے گھر کی الماریوں میں پڑے پڑے دیمک اور کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو رہے ہیں مگر اُن کی پڑھی لکھی اولاد کو اس بات کا قطعی کوئی احساس نہیں ہے، میری کئی دفعہ کی درخواست کے باوجود ان الماریوں کے تالے نہیں کُھل سکے۔‘‘ (۱۹)

[۳]

سیرِ سوات حکیم محمد یوسف کی کم وبیش ایک ماہ کی سیاحتِ سوات کا خوش نما آئینہ ہے۔ اس آئینے میں حکیم صاحب کے احوالِ سفر کی رنگا رنگ تصویریں، اُن کے مشاہدے کی دل پذیر جھلکیاں، سوات کے قدرتی مناظر کا حسنِ دل آویز اور والیان وساکنانِ ریاست کے حسنِ سلوک اور رنگِ تواضع کے واقعات پوری صفائی کے ساتھ دکھائی دیتے

ہیں۔ یہ سفر ۸ رجون ۱۹۴۴ء میں حضرو سے آغاز ہوااور ایک ماہ کے بعد حضرو ہی میں اپنے انجام کو پہنچا۔اس سفر میں حکیم محمد یوسف حضروی کے ساتھ اُن کے ایک ملازم اور ایک دوست حافظ غلام عمر شریک تھے۔ حکیم صاحب کے بہ قول یہ ایک معمولی سفر تھا مگر دوست احباب کے مسلسل اصرار اور تقاضوں کے باعث انھوں نے چشم دید واقعات اور سفر کی کیفیات کو سیر سوات کی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔اس سفر نامے کو قلم بند کرنے کی دوسری بڑی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ متعصب ہندو، مغربی مصنفین اور عام نفرت آفریں صحافتی واخباری دُنیا مسلمانوں بالخصوص صوبۂ سرحد کے غیور اور بہادر پٹھانوں کے خلاف اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں زہر افشانی کر کے اُن کے اوصاف کو دبانے اور اُن کی خرابیوں کو نمایاں کرنے کا جتن کرتے ہیں جو سراسر تعصب اور بد نیتی کا مظہر ہیں۔ان کا خیال ہے:

> ''ہم نے جو کُچھ بھی اس کتاب میں پیش کیا ہے،اس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ قارئین کے دل میں پٹھانوں کی تہذیب وشائستگی ورواداری کے جو اثرات ثبت ہوں گے وہ ان سے بالکل مختلف ہوں گے جو متعصب غیر مسلم سیّاح یا مغرب کے عام اخبار وتصنیفات نے دلوں پر نقش کر دیے ہیں۔''(۲۰)

حکیم محمد یوسف حضروی کے نزدیک سیاح کا عمومی فرض ہے کہ دیانت داری اور سچائی کے ساتھ وہ تمام حالات وواقعات،عوام کے فوائد کے لیے منظرِ عام پر لائے جو کسی ملک یا قوم کے متعلق اُس نے معلوم کیے ہوں۔انھوں نے اسی نقطۂ نظر کے تحت اپنے سفر نامے میں ریاست سوات کے جغرافیائی،تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور انتظامی حالات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے وہ اپنے اس سفر نامے کے حوالے سے خود رقم طراز ہیں:

> ''سیر یا سفر نامے میں جس قسم کی اطلاعات لازمی اور ضروری ہوتی ہیں مثلاً

ملک کے حالات، انتظام کا طریقہ، عدالتی نظام، کیفیت واصولِ تجارت،عمارات، رسم ورواج، تمدن ومعاشرت،درس وتدریس کے قواعدوغیرہ، اگرچہ اس تفصیل کے ساتھ اِس میں موجودنہیں ہیں، جتنے ہونے چاہییں، پھربھی ان حضرات کے لیے جنھیں اسلامی ممالک کے معمولی واقعات سے بھی دل چسپی ہے،ان کی خدمت میں خصوصاًاور دیگر قارئینِ عظام کی نگاہوں کے سامنےعموماًیہ ماحضرپیش کیاجاسکتاہے۔''(۲۱)

سیرِسوات میں شامل منظومات سے حکیم یوسف حضروی کی شعری استعداد اور قدرتِ کلام کا اظہار ہوتا ہے ۔انھوں نے عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہے ہیں۔ افسوس! کہ ان منظومات کے علاوہ اُن کے شعری آثار وقت کی گرد میں گُم ہو چکے ہیں۔معلوم کلام سے اُن کی کہنہ مشقی اور پُرگوئی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔**سیرِ سوات** میں ایک فارسی منظومہ سوات کے عنوان سے ہے جس میں سوات اور والیِ سوات کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔سترہ اشعار کاایک اُردوقصیدہ ولی عہد بہادر عبدالخالق جہاں زیب کی مدح میں ہے۔**سیرِ سوات** بھی انھی کے نامِ نامی سے منتسب کی گئی ہے۔ایک عربی قصیدہ والیِ سوات کی مدح میں ہے جوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔اُردو میں بھی دس مدحیہ اشعار والیِ ریاست کی شان میں کہے گئے ہیں۔ ذیل میں متذکرہ بالا چاروں منظومات سے بہ طورنمونہ چنداشعارپیش کیے جاتے ہیں تاکہ حکیم محمد یوسف حضروی کی شعری صلاحیت اورقدرت کااندازہ لگایاجاسکے:

سوات اے سوات اے مہرِ عالم تابِ علم
صبح بیدار از تو شامِ خوابِ علم
آستینت مخزنِ جود وکرم

آستانت مرجعِ اربابِ علم
ذرۂ صحرائے تو خورشیدِ فضل
قطرۂ دریائے تو سیلابِ علم (۲۲)

قصیدہ در مدح حضور فیض گنجور ولی عہد بہادر جناب عبدالخالق جہاں زیب

پس از ثنائے خدائے قدیر وربِ غفور
و بعدِ نعتِ رسولِ امیں سراپا نور
قلم پہ فرض ہوئی مدح عبدِ خالق کی
سوات کے ہیں ولی عہد جو بہت مشہور
یہ کرو فر ،یہ تجمل ، یہ شان اور یہ شکوہ
کہاں گئے جم و دارا و قیصر و فغفور
کہاں ہے آج سکندر یہ شوکتیں دیکھے
جو اپنے جاہ و تجمل پہ تھا بہت مغرور
وہ بارگاہِ بلند احتشام ہے اس کی
کہ بارگاۂ سکندر ہے پست جس کے حضور
شجاعت ایسی کہ شیروں میں دھاک ہے جس کی
زبانِ تیغ پہ جرأت کا اس کی ہے مذکور
کیا وہ صاحبِ اقبال حق تعالیٰ نے
کہ گردنیں رہیں خم ،سرکشوں کی ،جس کے حضور (۲۳)

قصیدہ فی مدحِ والیِ سوات دام ظلہٗ

حَمِدْتُ اللّٰہ ۔ ذُوالْطُّفِ الْمَدِیدِ

هُوَ الصَّمَدُ المُهَيمِنُ لِلْعَبيدِ
اُصَلِّی بَعْدَہ‘ اَعدَادَ رَمْلٍ
عَلیٰ خَیرِ النبیینَ الفَرِیدِ
فَبَعْدَ الحَمدِ وَالصَّلَواتِ طُرّاً
سَاَذکُرُ مَن یّبَعَّدُعَنُ نَدِدِیدِ
رَعَایَاہُ لَدَیہِ فِیْ ابْتِہاجٍ
وَکُلُّ النَّاسِ فِیْ عَیشٍ رَغِیدِ
حَلَیْم“ عَادِل“ ذُومَکرُمَاتٍ
کَرِیم“ مُّکرَم“ عِنْدَ الْمَجِیدِ(۲۴)

درمدحِ والیِ ریاست

وہ آسماں وقار ، مہٴ اوجِ سروری
جس کی نظر ہے مائلِ انصاف گستری
وہ نیّرِ جہانِ کمالاتِ کشوری
شرمندہ جس کے سامنے بختِ سکندری
نام اُس کا خاص و عام میں عبدالودود ہے
حاصل اُسے رضائے خدائے ودود ہے
ذروں کو اس نے نور سے معمور کر دیا
ملکِ سوات ،جلوہٴ گہٴ طور کر دیا
دربار اُس کا مرجعِ اہلِ کمال ہے
ہر ایک علم وفن میں عدیم المثال ہے(۲۵)

حکیم محمد یوسف حضروی اگرچہ باقاعدہ ادیب نہیں تھے مگر شعروادب کے گہرے وقوف اور عربی وفارسی کے بسیط مطالعے نے اُن کی تحریر کو ادیبانہ دل کشی اور شاعرانہ جاذبیت عطا کی ہے۔ اُن کا اسلوبِ نگارش خوش رنگ اور پُرتاثیر ہے۔ اُن کے سفرنامے میں کہانی کا سا بہاؤ ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش آمدہ مناظر اور واقعات کو خوش نما اسلوب میں بیان کرتے ہیں جو قاری کی توجہ کو اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ کہیں کہیں اُن کے اسلوب میں طنز اور ظرافت کا رنگ شامل ہو کر اُن کے رنگِ تحریر کو مزید دل کشی عطا کر جاتا ہے۔ اُن کے اس اسلوبِ خاص کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

O ''اس ملک کی زمین کے متعلق فرشِ گل کا تخیل ایک ادنیٰ تخیل ہے۔ اگر کہیں اس فرشِ زمردیں پر نسیمِ نکہت بار شوخیاں کرتی پھرتی ہے تو دوسری طرف جب قطرہ ہائے شبنم اُچھل اُچھل کر فرش پر گرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عروسِ فطرت کا ہار ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا ہے اور غیر مقدس ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے زمین اپنے سینے میں جذب کر رہی ہے۔''(۲۶)

O ''نوشہرہ چھاؤنی کی دل کشا سڑکیں، کناروں پر کوٹھیاں اور خوب صورت بنگلے، سڑک کے کناروں پر جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں، سرو اور شمشاد کے درختوں کی نگاہ پرور قطاریں اور صبح کے وقت اُن کی سرسبزی اور شادابی دیکھ کر بے ساختہ انسانی دماغ کی جدوجہد کی داد دینی پڑتی تھی۔ جس وقت تانگہ دریائے کابل کے سینہ پر سے کشتیوں کے پُل کے ذریعے عبور کر رہا تھا اور ہوا، آبِ سرد میں نہائی ہوئی ہم لوگوں کے چہروں سے مَس ہوتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہم لوگ بہشتی ہواؤں کے نمونے دیکھ رہے ہیں۔ سرد ہوا کی اٹھکھیلیاں، طبیعت میں شگفتگی، روح میں بالیدگی، خیالات واحساسات میں تازگی پیدا کر رہی تھی اور کچھ دیر کے لیے ہم کل کی آتش باری اور شب کی

گرمی کے تمام مصائب فراموش کر چکے تھے۔''(۲۷)

O ''حافظ صاحب نے سلام وکلام کے بعد کمرے کے متعلق کہا اور انھوں نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ یہ پھاٹک والا کمرہ دے دو کیوں کہ اور کمروں کے مقابلے میں یہاں زیادہ آرام ملے گا۔ چناں چہ وہ مقفل کمرہ، جسے کمرہ کہنا بھی توہین ہے، جو اپنے [اپنی] ہیئتِ کذائی سے اقطاعِ عالم کی تمام تعمیرات کو یقین دلا رہا تھا کہ میں بھی تاریخِ آثارِ عتیقہ سے قبل کی یادگار ہوں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنے سمجھ میں نہ آنے والے رنگ وروپ کے ساتھ زمین کا بوجھ بنا ہوا ہوں اور دُنیا کو اپنی قدامت کا ہر وقت یقین دلا رہا ہوں اور اختتامِ کائنات تک یقین دلاتا رہوں گا۔''(۲۸)

O ''چار باغ سے گزرتے وقت ہماری نظر پڑی تو دُور افق میں قضا گٹ پہاڑ کی بلند ترین اور سیاہ چوٹی ایک خوف ناک انداز سے ہمیں تک رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کو طے کرتے ہوئے چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ختان ٹیلے سے گزرتے ہوئے قضا گٹ پہاڑ کے دامن میں پہنچے ہی تھے اور نہ معلوم کیا کیا سونچ [سوچ] کر خوش ہو رہے کہ یکا یک ایک دھما کہ والی خوف ناک آواز سُنی اور تمام خیالات کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔''(۲۹)

حکیم یوسف حضروی کے اس سفرِ سوات کا آغاز حضرو سے ہوا۔ حضرو سے اٹک تک کا سفر تانگہ میں ہوا۔ پانچ گھنٹے میں یہ سولہ میل کی مسافت طے ہوئی۔ راستے کی دشوار گزاری، موسم کی شدت اور لُو کے طمانچوں نے مسافروں کو بے کل کیا۔ یہاں سیٹھ عبدالغنی کے گھر پر سستانے اور آرام کرنے کا پروگرام تھا۔ یہاں کھانا کھایا گیا، آرام کیا گیا اور دریائے سندھ کے ٹھنڈے پانی سے تھکن اور سفر کی صعوبت اُتارنے کا جتن کیا گیا۔ رات کے وقت اٹک سے

نوشہرہ کے لیے بہ ذریعہ ریل گاڑی روانہ ہوئے۔ صبح سات بجے نوشہرہ سے پھر تانگے کا سفر شروع ہوا جو مردان جا کر ختم ہوا۔ یہ سفر کل کے مقابلے میں قدرے خوش گوار تھا۔ مردان کے جس ہوٹل میں قیام کیا اُس کی کہنگی اور خستگی نے حکیم صاحب کے ذوقِ نفیس کو مجروح کیا مگر مجبوراً وہیں رات گزارنی پڑی۔ مردان سے گاڑی کے ذریعے وہ ریاست سوات تک پہنچے۔ ریاست کے خوش رنگ مناظر سے بغل گیر ہوئے تو سفر کی تکان پل دو پل میں ہوا ہو گئی۔ حکیم محمد یوسف حضروی کا ریاستِ سوات میں مہینے بھر کا قیام خوش گوار رہا۔ اصحابِ علم و فضل اور رئیسانِ سوات سے دوستانہ ملاقاتوں کے علاوہ ولی عہد بہادر سے ملاقات اور والیِ ریاست سے خصوصی ملاقاتوں نے حکیم صاحب کو بہت سرشار کیا۔ بے پناہ قدر افزائی اور والہانہ پذیرائی نے انھیں بہت خوش وقت کیا۔ وہ باشندگانِ سوات کی مہمان نوازی، قدردانی، ریاست کے والیان کی کرم گستری، حسنِ انتظام اور مناظر کی دل پذیری سے خوش ہی نہیں مرعوب بھی دکھائی دیتے ہیں اور جا بہ جا تحسینی کلمات ادا کر کے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

سیرِ سوات اگرچہ مختصر سا سفر نامہ ہے مگر بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق اس کے آئینے میں ریاستِ سوات کی ایک مکمل اور واضح تصویر دکھائی دیتی ہے۔ سفر نامہ نگار نے محض اپنے سفر کے احوال ہی بیان نہیں کیے بلکہ ریاست کے جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، مذہبی، تنظیمی اور معاشی حالات اور اس کے مختلف اداروں کی کارگزاری کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ حکیم صاحب کی نظر ہر پہلو پر برابر پڑتی ہے اور وہ جزئیات کے ساتھ اس کی کامل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان تصویروں میں اُن کے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ ریاست سوات کے رہنے والوں کے لباس اور پوشاک کے بیان میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''مَردوں کا لباس عموماً طرزِ جدید کی قمیص اور ویسٹ کوٹ، شلوار اور پگڑی اور کلاہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ قمیص کی جگہ خلکہ پہنتے ہیں جو لمبائی میں

پائجامہ کے پائنچوں سے ایک بالشت اونچا رہتا ہے اور اس کا گھیرا ڈھائی تین گز کا ہوتا ہے۔ سامنے کے رخ گلے سے نیچے تک کھلا ہوا ہوتا ہے۔ صرف ناف کے قریب ایک بٹن ہوتا ہے اور آستینیں چوڑی ہوتی ہیں۔ اسے وہاں قادری خلکہ بھی کہتے ہیں۔ خلکہ پہننے والے عام طور پر گول پیچک کی طرح سر پر بڑی پگڑی باندھتے ہیں۔ پہلے یہ ململ کے ایک پورے تھان کی ہوتی تھی مگر اب اس میں کسی قدر تخفیف ہو گئی ہے۔ یہ لباس زیادہ تر وہاں کے علما اور خوانین کا ہوتا ہے۔''(۳۰)

حکیم صاحب کے نزدیک چوں کہ سفرنامہ نگار کا اولین مقصد ان حالات وواقعات کو صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کرنا ہے، جن سے وہ دورانِ سفر دوچار ہوا تا کہ قارئین بھی اس علاقے کے حالات وواقعات سے باخبر ہو سکیں۔ اپنے اس خیال کے مطابق انھوں نے اپنے سفرنامے کو معلومات کا گنجینہ بنادیا ہے۔ یوں اس مختصر سے سفرنامے میں قیامِ پاکستان سے قبل کی ریاستِ سوات کا رقبہ، اس کی آبادی، باشندوں کا رہن سہن، ان کے ملبوسات، اخلاق وعادت، ریاست کے قصبات وشہر، تعلیم، انتظامِ حکومت، عدالت وقوانین، حفظانِ صحت، محکمۂ ڈاک وٹیلی فون، سڑکیں ، پُل، محکمۂ آب رسانی، فوج ، پولیس، مال گزاری، مہمان خانے اور ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات جیسے موضوعات پر کارآمد اور مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ اُردو سفرنامہ نگاری کی روایت میں اپنی منفرد خصوصیات کے باعث حکیم محمد یوسف حضروی کا سفرنامہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) **اٹک ڈسٹرکٹ گزٹیئر (انگریزی)**؛ سی سی گاربٹ؛ لاہور؛ گورنمنٹ پرنٹنگ پنجاب؛ ۱۹۳۰ء؛ ص ۳۱۸۔

(۲) بہ حوالہ: **دامنِ اباسین**؛سکندر خان؛ویسا ضلع اٹک؛ملی کتب خانہ؛سوم، ۲۰۰۴؛ص ۴۲۔

(۳) **دھن ملوکی**:انور بیگ آوان؛اسلام آباد؛لوک ورثہ کا قومی ادارہ؛جنوری،۱۹۸۱؛ص ۱۰۔

(۴) **چھاچھی بولی**: ارشد محمود ناشاد؛ اٹک؛ پنجابی ادبی سنگت؛ دسمبر، ۲۰۰۴ء؛ص ۱۴۔

(۵) ''چھچھ تاریخ کے آئینے میں'' (مضمون)؛خواجہ محمد خان اسد؛مشمولہ سہ ماہی العلم؛ کراچی؛ جلد ۴۳،شمارہ ۱۔

(۶) **سفرنامہ**:امین چند، منشی؛لاہور؛مطبع کوہِ نور؛ بارِ دوم،۱۸۵۹ء؛ص ۱۰۹۔

(۷) **دامنِ اباسین**:ص ۲۲۳۔

(۸) مکتوب حکیم محمد یوسف حضروی بہ نام سلیمان خان؛ مرقومہ ۳ر مئی ۱۹۱۴ء؛ مملوکہ راشد علی زئی، حضرو۔

(۹) **دامنِ اباسین**:ص ۱۲ ۴، ۱۳ ۴۔

(۱۰) راشد علی زئی: علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی (مضمون)؛مطبوعہ روزنامہ جنگ،لندن؛

(۱۱) مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱ر اکتوبر ۲۰۱۸ء

(۱۲) **سیرِ سوات**:**حکیم محمد** یوسف حضروی؛کلکتہ؛اکسیراتِ ہند دواخانہ؛[۱۹۴۴ء]؛ص ۱۹۰،۱۹۱۔

(۱۳) **فلسفۂ شادی**:محمد یوسف حضروی؛کلکتہ؛اکسیراتِ ہند دواخانہ؛[۱۹۴۶ء]؛ص ب۔

(۱۴) ''علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی'' (مضمون): راشد علی زئی؛ مطبوعہ روزنامہ جنگ،لندن؛

(۱۵) مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱ر اکتوبر ۲۰۱۸ء

(۱۶) **دامنِ اباسین**:ص ۳۴۴۔

(۱۷) مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱ر اکتوبر ۲۰۱۸ء

(۱۸) ''تبصرہ'': عبدالماجد دریابادی؛لکھنؤ؛ **سچ**؛ ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء۔

(۱۹) ”علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی“ (مضمون): راشد علی زئی؛ مطبوعہ روزنامہ جنگ، لندن؛

(۲۰) مقدمہ مشمولہ: **سیرِ سوات**: ص ۴۔

(۲۱) ایضاً: ص ۴۔

(۲۲) **سیرِ سوات**: ص ا۔

(۲۳) ایضاً: ص ب، ج۔

(۲۴) ایضاً: ص ۸۰۔

(۲۵) ایضاً: ص ۱۷۔

(۲۶) ایضاً: ص ۱۱

(۲۷) ایضاً: ص ۲۸، ۲۹۔

(۲۸) ایضاً: ص ۳۰۔

(۲۹) ایضاً: ص ۶۲، ۶۳۔

(۳۰) ایضاً: ص ۹۵، ۹۶۔

OOO

ڈاکٹر ریاض توحیدی

عذابِ دانش حاضر اور اقبالؔ

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل مابعد جدید دور کی ثقافتی صورت حال (Post Modern Cultural Condítion) اور مابعد جدید تنقید (Post Modern Criticism) کے تناظر میں جب کلام اقبالؔ کی متنی ساخت ((Textual Structure) کو ردتشکیل تھیوری (Deconstruction Theory) کے پیش نظر زیر بحث لایا جائے تو تخلیقی سطح پر بیشتر کلام نہ صرف مابعد جدید دور کے سیاسی' سماجی' تہذیبی اور معاشی مسائل کا ڈسکورس سامنے لاتا ہے بلکہ موضوعاتی ومعنیاتی طور پر عصر حاضر کے ہلاکت خیز اندیشوں کی کرب ریز صورت حال کی مفکرانہ پیش گوئی (Prediction) بھی کررہا ہے۔کلام اقبالؔ کا یہی تخلیقی وموضوعاتی اظہار نہ صرف دورجدید کے انسان کو عذاب دانش حاضر کے جمہوری جبریت (Democratic Determinism) سے آگاہ بلکہ اسکے داخلی جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی کررہا ہے اور شعری تنقید (Poetic Criticism) کا یہی اختصاص کلامِ اقبالؔ کی عصری معنویت یا معاصر چیلنجز کا جواز بھی فراہم کررہا ہے۔

عذابِ دانش کا یہ جمہوری کرب' نمرودی آگ بن کر کئی عشروں سے معصوم اور کمزور انسانوں کو بھسم کرتا آیا ہے۔جنگ عظیم اول ودوم کے روح فرسا سانحات کے ذمہ دار جمہوری دیو استبداد یعنی امریکہ اور اس کے حوارین کا جمہوری لبادے میں آگ وخون

کھیلنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔علاّمہ اقبالؔ نے اس جمہوری نظام کے پس پردہ مکروہ عزائم کو بھانپ کر اسی وقت اہل دانش وبینش کو خبر دار کیا تھا کہ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی نیلم پری

اور وقت نے ثابت کر دیا کہ جمہوریت کے علم بردار یہ کالے اور سفید دیو کس طرح جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر انسانیت کو اپنے قدموں تلے روندھے چلے جا رہے ہیں۔ چاہئے وہ عراق ولبیا میں لگائی گئی ہولناک آگ کے خون فشاں مناظر ہوں یا چاہئے فلسطین وافغانستان یا دنیا کے دیگر مظلوم ومحکوم انسانوں پر ڈھائے جا رہے جمہوری مظالم کی داستان الم ہو۔مغرب یا امریکہ کے ان جدید جمہوری مظالم کا اگر پیام اقبالؔ کے تناظر میں جائزہ لیں اور اس پیام کی عصری معنویت پر غور کریں تو انہوں نے جس طرح ۱۹۳۵ء میں اپنی نظم ''مسولینی۔۔۔اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے'' میں مسولینی کی زبان سے جمہوریت کے ٹھیکیداروں کی سیاہ کاریوں کو بے نقاب کیا تھا تو کیا وہی صورت حال آج بھی جاری نہیں ہے۔علاّمہ اقبالؔ اس نظم میں مسولینی کی زبان سے کڑوی سچائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسولینی کو ظالم وجابر کہنے والے کیا خود بھی عملی طور پر ظالم ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔اگر ہم اس نظم کو عصری معنویت کے تناظر میں مسولینی کے بدلے صدام حسین یا کرنل قذافی کے جذبات میں پرکھیں تو کیا جمہورت کے دعویداروں کی وہی دوغلی پالسی اور جابرانہ عزائم ہر جگہ دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم

تم نے کیا توڑے نہیں کمزوروں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ رہے، نہ راج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت وتاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

(ضربِ کلیم)

کلامِ اقبالؔ کے کئی اشعار کے تخلیقی متن کے بین المتونی (Inter Textual) مطالعہ سے ظاہر ہے کہ انہوں نے شعر گوئی کو فنی مستی کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے شعوری طور پر اپنی شاعری کو نظریاتی وسیلہ بنا دیا۔ انہوں نے گل وبلبل کی ترنم سازی کے برعکس مقام آدمیت وانسانیت کے گیت سنائے، بقول ممتاز نقاد پروفیسر قدوس جاوید: ''شعر اقبالؔ اپنے غیر معمولی متون کی بناء پر انسان اور انسانیت کے حوالے سے صورِ اسرافیل کا حکم رکھتا ہے۔ اقبالؔ کے متون یہ ثابت کرتے ہیں کہ صد پہلو انتشار و بحران کے اس دور میں ہر سطح پر انسان کی کامل بیداری ہی اقبالؔ کا مشن تھا اور اسی کے حوالے سے اقبالؔ کے متون میں عصری، سیاسی، تہذیبی، عمرانی اور فنی حتیٰ کہ رسمی صوفیانہ اقدار پر بھی نکتہ چینی ملتی ہے۔''

(اقبالؔ کی تخلیقیت۔ص ۱۴۳)

اسی نظریہ ساز پیام کے توسط سے علاّمہ اقبالؔ نے مغرب کے پوشیدہ مفاد پرستانہ نظریات کے دبیز پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا۔ مغرب کی کئی دہشت پسند تنظیمیں (جن کے نام تک مغرب سے مرعوب انسانوں کو معلوم نہیں ہونگے) کے نظریات اور عملی اقدامات دیکھ کر

باشعور انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔مغرب کی ایک تنظیم ''شیطانیت'' (Satanism) کا تنظیمی نظریہ ہے کہ انسان کو اپنا مقصد پانے کے لیے کسی بھی حد کو پار کرنا چاہیئے۔اس تنظیم کا ایک رکن اپنے مقاصد کے سلسلے میں کہتا ہے:

'I feel laws are, obviously, made to be broken.I see nothing wrong with robbing somebody on the street."

(Terrorism..The Ritual of the Devil.P66)

''میں سمجھتا ہوں کہ قوانین تو بنائے ہی جاتے ہیں توڑنے کے لیے۔میں راستے میں کسی بھی انسان کو لوٹنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا ہوں۔''

ان ہی نظریات کے حامل افراد دنیا کو جمہوریت اور انسان دوستی کا سبق پڑھاتے رہتے ہیں۔یہ سب ڈھونگ صرف اپنے پوشیدہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے رچایا جاتا ہے بلکہ ذرا سنجیدگی سے سوچیں تو جمہوریت' چنگیزیت کا جدید روپ ہے کیونکہ کیا آج مغرب' جمہوریت کی آڑ میں اپنے مقاصد کی خاطر کسی بھی قانون کی پاس داری کرتا نظر آرہا ہے۔۔۔؟ہر جگہ ''فلسفۂ بے رحمی'' (Theory of Ruthlessness) اور ''دور دہشت'' (Terror Reign) پھیلا ہوا ہے۔جس کی تازہ مثال افغانستان میں گرائے گئے ایک غیر جوہری طاقتور بم GBU-43/B (جس کو Mother of all bombs کہا جاتا ہے) کا انسانیت کش تجربہ ہے جس کی تباہ کاری پر امریکہ کی بربریت کا اتحادی افغان صدر حامد کرزائی بھی بی۔بی۔سی کی انگلش نیوز سروس پر ایک طرف واویلا کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ اقدام دہشت گردی کے جواز میں افغانستان کے خلاف کھلی جارحیت ہے تو دوسری جانب امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کا صدارتی بیان دکھایا جارہا تھا کہ ''یہ بم گرانے پر امریکہ کو اپنے جنگی تجربات پر فخر ہے۔'' جمہوریت کے اس روپ کی اندوہناک

صورت حال پر نہ صرف علاّمہ اقبالؔ بلکہ کئی اور مغربی شعراء نے پہلے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً میتھو آرنلڈ کی نظم ''Dover Beach'' کے یہ علامتی مصرعے دیکھیں:

"Nor certitude ,no peace, nor help for pain
And we are here as on a darkling plain Swept with confused alarams of struggle and plight
Where ignorant armies clash by night "

علاّمہ اقبالؔ جمہوری جبر کی اس تاریخی جبریت (Historical Determinism) کے پوشیدہ حقائق کو نثر و نظم میں جگہ جگہ اجاگر کرتے نظر آرہے ہیں، اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ جمہوریت کامل سیاسی سکون کی ضمانت ہے تو وہ تاریخ سے بالکل ناواقف ہے۔ حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے۔ جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات وشکایات کو پھر سے ابھرنے کا موقع ملتا ہے جنہیں شخصی حکومت کے دور میں دبایا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو۔''

(کتاب، اقبالؔ نئی تفہیم۔۔۔ص ۳۸۵)

اسی طرح یورپ والوں کے علم و دانش اور سیاسی عزائم کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

کیا آج بھی مغرب کی یہ جارحانہ سیاست مساوات کے نام پر معصوم انسانوں کا خون نہیں بہاتی ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں ہی کتنے ایسے واقعات پیش آئے کہ دہشت گردی کی آڑ میں ڈرون حملے کر کے کئی اسکولی طلبہ کو پڑھنے کے دوران زندہ دفن کر دیا گیا اور کف افسوس ملنے کی بجائے اسے جمہوریت کی بحالی کا دعویٰ کیا گیا۔ مغرب کی اس دہری پالسی کو علاّمہ اقبالؔ کی طرح کئی اور تخلیق کار بھی موضوع گفتگو بناتے آئے ہیں جیسے افسانہ ''ہائی جیک'' کے یہ جملے دیکھیں:

''ڈرون حملے میں اسکول تباہ، درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دہشت گردی ہے، حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں، ایسے اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لیے ضروری ہیں۔'' سفیر امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

''یہ دہشت گردی ہے'' سفیر امن کا بیان۔ ''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائیگا۔''

(ہائی جیک۔۔۔ڈاکٹر ریاض توحیدی)

مجموعی طور پر دیکھیں تو موجودہ دنیا کے پُرتناؤ ماحول کے پیش نظر کلام اقبالؔ کی عصری معنویت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے کیونکہ انہوں نے شرق و غرب کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا تھا اور اپنے کلام میں ان مسائل کو ایسے تخلیقی پیرائیہ میں پیش کیا کہ ان کی مستقبل آشنا معنویت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ فکر اقبالؔ کی معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے معروف اقبالؔ شناس پروفیسر بشیر احمد نحوی ایک مضمون ''نئی صدی میں شاعر مشرق کی معنویت'' میں لکھتے ہیں: ''فکرِ اقبالؔ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہے، اس کی گہرائی میں شعور، علم تجربہ، دردمندی اور سوز و گداز کے ان گنت خزانے ہیں۔ جب بھی ایک سنجیدہ قاری اس سمندر میں غوطہ خوری کرتا ہے تو نئے گہر اور نئے صدف اس کے ہاتھ آجاتے ہیں۔۔۔''

(رسالہ اقبالیات۔ص ۳۴۔شمارہ ۱۷)

زیر نظر مضمون میں کلام اقبالؔ کے پیش نظر صرف دور حاضر کی جمہوری استعماریت (Democratic Imperialism) کے اس مکروہ چہرے کے چند جلوئے ہی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے سیاہ سایے ہم سب دیکھ رہے ہیں، ویسے بھی علاّمہ اقبالؔ نے فرنگی سیاست کو ''دیو بے زنجیر'' کہا ہے اور ان مرعوب اذہان کی ناسمجھی پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو آنکھیں بند کر کے مغربی تہذیب کے ہر جلوئے کو روشنی کی چمک سمجھ رہے ہیں:

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر! افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے!

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو مجھ کو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

پروفیسر شمس القمر عاکف

اردو غزل میں تعلّی کی روایت

اردو غزل جہاں بہ ذاتِ خود ایک شعری روایت کا نام ہے، وہاں اس سے وابستہ مخصوص روایات بھی ہیں، جو غزل کی روایات کہلاتی ہیں۔ مثلاً تغزل، سوز و گداز، عشق و محبت کی واردات، ہجر وصال، تصوف، بے ثباتیِ دنیا، رندی و سرمستی وغیرہ۔ اردو غزل کی ان روایات کا سلسلہ اولاً فارسی اور پھر فارسی کے تعلق سے عربی شاعری کی روایات سے جا ملتا ہے۔ اردو شاعری کی بے شمار روایات میں سے ایک روایت "تعلّی" بھی ہے جو قصیدے، مثنوی، مرثیے، قطعے سمیت تقریباً ہر صنف سخن کا حصہ رہی ہے؛ لیکن اردو غزل نے اس روایت کو بہ طور خاص اپنایا اور ہر دور کے شعرا نے غزل کے اشعار میں "تعلّی" سے کام لیا۔ تعلّی کے یہ اشعار شاعر کے فن اور اس کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

تعلّی: معنی و مفہوم: تعلّی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ "علوٗ" بہ معنی

ہیں۔ (1) فیروز اللغات: ہوئے

بلندی، ترقی، بزرگی، بڑائی ۔ (2) فرہنگِ آصفیہ: بلندی، برتری، درجہ بہ درجہ ترقی، شیخی، گھمنڈ، اپنے تئیں سب سے اعلیٰ سمجھنا۔ (3) نور اللغات: شیخی، ڈینگ۔

شیخی بگھارنا، ڈینگ

مارنا" اردو میں رائج ہیں۔

تعلّی کے اصطلاحی معنی "خود تعریفی" اور خود ستائی کے ہیں؛ یعنی اپنی اپنی صلاحیتوں اور قدرتوں کا بیان خود کرنا، اپنے کسی وصف یا کمال کی تعریف کرنا، دوسروں پر

اپنی برتری کا اظہار کرنا اور اپنے فضائل کا اپنے آپ چرچا کرنا وغیرہ۔

اردو غزل میں ہر چھوٹے بڑے شاعر کے ہاں تعلّی پر مبنی مضمون پائے جاتے ہیں۔بعض کے ہاں کم جب کہ بعض کے کلام میں کثرت سے تعلّی کے اشعار ملتے ہیں۔تعلّی کا مضمون مطلع سمیت غزل کے کسی بھی شعر میں نظم ہوسکتا ہے۔کئی شعرا کی پوری پوری غزلیں تعلّی کے مضامین پر مشتمل ہیں؛ تاہم مقطع میں تخلص کے استعمال کے موقع پر اپنے کلام کی داد خود دینا تلامیذ الرحمٰن کا پسندیدہ شیوہ رہا ہے۔

تعلّی کی اقسام: اردو غزل میں تعلّی پر مبنی مضامین کا جائزہ لیا جائے تو اس کی کئی قسمیں رائج نظر آتی ہیں۔مثلاً

1۔شاعر کا اپنے علم و فضل اور شاعرانہ کمالات کا ذکر اور دوسروں پر اپنی برتری کا دعویٰ

2۔تصوف کے حوالے سے انسان کی برتری اور عظمت کے مضامین نظم کرتے ہوئے اپنی برتری کا اظہار:

3۔صوفیانہ شطحیات اور رندانہ اندازِ تعلّی جس میں زاہدوں اور پارساؤں کے مقابلے میں اپنی رندی کو بہتر ثابت کیا جاتا ہے۔

4۔محبوب کے غرورِ حسن کے مقابلے میں جنونِ عشق کی برتری کا بیان،اس قسم کے مطالب بہت حد تک واسوخت کے مضامین سے ملتے جلتے ہیں۔

تعلّی کے یہ سارے رنگ اردو غزل میں عام ملتے ہیں۔اساتذہ کے دیوان ہر قسم کی تعلّی کے اشعار سے بھرے ملتے ہیں۔ہر رنگ کے مضامینِ تعلّی متنوع اور دل چسپ پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔تاہم زیرِ نظر مقالے میں قسمِ اول "شاعرانہ تعلّی" سے سروکار ہے؛ جس میں شعرا لطیف پیرائے میں اپنے فن کی ستائش کرتے ہیں،اپنی حیثیت منواتے

ہیں، مخالفین کی للکار کا جواب دیتے نظر آتے ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں خود کو برتر اور بلند تر ثابت کرتے ہیں، جیسے مرزا محمد رفیع سودا کا اردو شاعری کے حوالے سے دعویٰ ہے کہ:

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سودا پسندِ خاطرِ دل ہا ہوا یہ فن مجھ سے

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

اسی طرح شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے اشعار کی تعریف میں یوں گویا ہیں:

ہیں معاصر گرچہ اپنے مصحفی خوش گو ولے کم کسی نے ریختہ ایسا بہ رعنائی کہا

شاعرانہ تعلّی کا مقصد و مدعا یکساں ہوتے ہوئے بھی ہر شاعر کے ہاں اس کے مضامین یکساں نہیں بلکہ تعلّی کے مضامین میں شعرا نے متنوع انداز اختیار کیے ہیں۔ چند نمایاں رنگ درج ذیل ہیں:

خود ستائی:

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے جوں پیشِ آفتاب ہو بے نور تر راغ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ستائش بہ زبان دیگر:

تعلّی کی اس روش میں شاعر دوسروں کی زبان سے اپنی مدح کرتا ہے۔ اس سے تاثر یہ پیدا ہوتا ہے جیسے ایک زمانہ شاعر کے فن کا اعتراف کر رہا ہے:

چشمِ کم سے نہ نظر مصحفیِ خستہ پہ کر وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مخالفین کو للکارنا: تعلّی کے اس نوع کے اشعار میں شاعر ہجو کے انداز میں اپنے مخالفین اور حاسدین کو للکارتا ہے، تعلّی کے پردے میں اپنے حریفوں کی خوب خبر لیتا ہے اور ان کو ہرانے یا کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے:

میں کہے دیتا ہوں انشا سے ذرا بچ کھیلیو وہ بلا ہے، قہر ہے، آفت ہے، اک استاد ہے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اساتذۂ سلف کی ہم سری: ہر دور کا شاعر سابق ادوار کے صاحبِ طرز اساتذہ کی برابری کرنے اور ان کے مقام و مرتبے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل میں وہ تعلّی کے پیرائے میں اساتذۂ سلف کی ہم سری کا دعویٰ کرتا ہے:

سوز کے اشعار کا کیا پوچھنا ہے شاعرو گفتگو میں اس کی پاتا ہوں نظیری کا دماغ

بعد استادِ ذوق کے کیا کیا شہرت افزا کلامِ داغ ہوا

اساتذہ سے داد طلبی: شاعر اپنے اشعار میں اساتذۂ فن سے اپنے شاعرانہ کمال کی داد بھی طلب کرتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار اتنے اعلیٰ ہیں کہ فلاں استاد بھی ان کو سنے تو داد دیے بغیر نہ رہ سکے:

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا کہ اس کی قدر کوئی کیا جُز انوری جانے

اس بحر میں کیا برجستہ غزل اے ذوق یہ تم نے لکھی ہے
ہاں وزن کو سن کر جس کے شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

اساتذہ کی تنقیص و تحقیر: بعض اوقات شاعر مسابقت کی دھن میں فنِ شعر کے اساتذہ کی تنقیص کا اسلوب اپناتے ہوئے اپنی بڑائی بیان کرتے ہیں۔ تعلّی کے اس قسم کے مضامین کی مثالیں یہ ہیں:

اس غزل کو سن کے خاقانی کرے وجدائے نصیر انوری بھی سر کو اپنے پٹکے پتھر سے جدا

ہے کارنامہ جب سے بیاض اپنی شیفتہ تقویمِ سالِ رفتہ ہے دیواں کلیم کا

الغرض شعرا اپنے مزاج، حالات اور موڈ کے مطابق تعلّی کے مضامین باندھتے ہیں۔ کہیں

حقیقت ہے تو کہیں مبالغہ آرائی، تعلّی کے ان مضامین کے پیچھے کارفرما ذہن شاعر کا نفسیاتی تجزیہ قابلِ غور ہوتا ہے۔تعلّی کے مضامین سے شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، جو اس کے مطالعے اور تجزیے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

تعلّی کے اسلوبیاتی عناصر: شعرالفظ کے جادو اور اسلوب کی سحر کاری کا بہترین شعور رکھتے ہیں۔تعلّی پر مبنی شعر کا مضمون خواہ جو بھی ہو،شاعر اسے اپنے اسلوب سے مؤثر بنانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔تعلّی کا استعمال چونکہ اپنی برتری یا دفاع اور دوسرے کی تنقیص یا ہجو کے موقع پر ہوتا ہے اس لیے شاعر کا صحیح مقام پر موزوں لفظ کے ہتھیار کو استعمال کرنے کا سلیقہ اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔تعلّی کے اشعار کا اسلوب اس لحاظ سے اہم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعر کے تیور اور انداز کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔شاعر ایک طرف فکر و فن کے آداب اور پابندیوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو منوانے اور حریف کو زیر کرنے کے لیے نئی تراکیب، اشاروں کنایوں اور استعاروں کی صورت میں اسلوب کے نئے نئے تجربات کرتا ہے۔کوشش یہی ہوتی ہے کہ مطلب کی بات اس طور سے زبان پر آئے کہ پیرایۂ بیان میں جدت اور انفرادیت قاری کے دل میں شاعر کی عظمت بٹھانے میں معاونت کرے۔مختلف رنگوں کے شعرا کے تعلّی کے متفرق اشعار کو ایک جگہ سامنے رکھ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلّی کا مضمون ادا کرتے ہوئے شعرا اپنے اندازِ بیان میں ایسا اچھوتا پن پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے اور ان کا دعویٰ بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ہر دور کے شاعروں نے کوشش کی ہے کہ روایتی تعلّی مثلاً کلام کو گوہر آب دار کہنے ،زمینِ شعر کو آسمان قرار دینے اور خود کو میدانِ شعر کا رستم کہ دینے سے گریز کرتے ہوئے نئے مضامین میں اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑے جائیں۔درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلّی کو مؤثر بنانے کے لیے نہ صرف سوچ بلکہ اظہار کا بھی نیا سلیقہ اپنایا ہے۔

تحریر میں سودا کی ہے جائے سخن کس کو		خامہ یدِ قدرت سے اس کا ہے تراشیدہ

میر دریا سنوں شعر زبانی اس کو اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

ہیں معنی بلند مرے عرش سے پرے مت کہ کہ بات درد کی کرسی نشیں نہیں

تعلّی پر مبنی اشعار کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

خطابیہ انداز: تعلّی کے اسلوب کو زیادہ سے زیادہ موزوں بنانے اور بے تکلفی کے اظہار کے لیے شعرا نے اکثر خطابیہ انداز اپنایا ہے۔ یہ اسلوب چونکہ بول چال کے نزدیک ہوتا ہے اس لیے اس سے باتوں ہی کی طرح چستی اور بے باکی پیدا ہوتی ہے اور یوں شعر پڑھنے والا تعلیٰ کے مضمون سے بھرپور تاثر لیتا ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا کہتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا (میر)

آؤ اور مجروح کی دیکھو غزل شوق تم کو ہے اگر اشعار سے (مجروح)

تشبیہ واستعارہ: تشبیہ واستعارہ کی خوبی یہ ہے کہ کسی چیز کی تصویر آنکھوں مین پھر جاتی ہے۔ تعلیٰ کے بیان کو مؤثر بنانے کے لیے شعرا نے تشبیہ واستعارہ کا استعمال مہارت سے کیا ہے۔ تعلیٰ کے مضامین میں تشبیہ واستعارہ سے جہاں شعر بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے، وہیں اظہارِ مطلب کی نئی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ چند تشبیہات واستعارات کا عالم یہ ہے:

مری زبان ہے ملک سخن میں ایک خیاط عروسِ معنی کا ہو ٹھیک پیرہن مجھ سے (سودا)

یہ تیرے شعر ہیں اے درد یا کہ نالے ہیں جو اس طرح سے دلوں کو خراش کرتے ہیں (درد)

مبالغہ: مبالغہ شاعروں کی مرغوب صنعت ہے جس میں چیزوں کو اصلی صورت سے بڑا دکھا کر ان کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ تعلیٰ کے زمن میں بھی شعرا مبالغے کا بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔ تعلیٰ کے مضامین جہاں مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں اور شاعر کے مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ وہیں تعلیٰ کے اشعار میں کہیں کہیں مبالغہ حدِ اعتدال سے تجاوز کرتا بھی نظر

آتا ہے۔ایسا مبالغہ اشعار کو بے اثر اور لفظی گورکھ دھندا بنا دیتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ شاعر محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر خود کو اپنے وقت کا فارابی اور افلاطون کہ رہا ہے۔ یہ مبالغہ شاعر کی شخصیت کی کجی کا پتا دیتا ہے۔ مبالغے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شعر میں بے مثال ہے مجروع معنیِ غالب وسلاستِ میر (میر مجروح)

وہ افسوں ہے ہماری شاعری میں جو سنتا گنگ ہوجاتا فغانی (آتش)

طعن و تشنیع: تعلّی کے اشعار کا اسلوب دیکھیں تو اکثر اوقات محسوس ہوتا ہے کہ مخالفین کو زیر کرنے کے لیے شاعر کھلے طعنوں سے کام نکالنا چاہتا ہے۔ گویا طعن و تشنیع کو حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ سمجھ کر شعوری طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور حاسدین کا قلع قمع کرنے کے لیے زبان سے تلوار کا کام لینا چاہتا ہے۔ چند مثالیں:

قائم سوائے اور بھی شاعر ہیں یاں بہت لیکن بہ حرفِ دردوگپ عاشقانہ کو (قائم)

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میر بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کے (میر)

شوخی و ظرافت: طعن و تشنیع کے کھلے حربوں کے مقابلے میں طنز کا حربہ زیادہ لطیف اور کارگر ہوتا ہے۔ جب طنز کا استعمال مزاح کے ساتھ ہو تو تلخی کم ہوجانے سے لطف اور بڑھ جاتا ہے۔ شعرا تعلّی کے بیان میں شوخی و ظرافت کو بھی اپنے اسلوب کا حصہ بنا کر ہنسی ہنسی میں اپنے دل کی بات کامیابی سے قاری کے دل تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً:

شعر دیواں کے میرے کر کر یاد مجنوں کہنے لگا کہ ہاں استاد (میر)

زباں کاٹ لوں تیری اور بھون کھاؤں مزا چکھوں اے سوز تیری زباں کا (سوز)

بلند آہنگی اور للکار: تعلّی کے اشعار کو زوردار بنانے کے لیے شعرا کے لہجے کی مردانگی اور بلند آہنگی توجہ کے لائق ہے۔ ہر شاعر کا مخالفین کو للکارنے کا اپنا خاص انداز ہے جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مثالیں:

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر　　　یہ ہماری زبان ہے پیارے　　(میر)
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے　　(داغ)

کم دماغی اور جھنجھلاہٹ: اگر مخالفین کے حملے شدید ہوں اور شاعر کو اپنی ناقدری کا واضح احساس ہونے لگے تو ایسے مایوس کن حالات میں شاعر کم دماغی اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔شاعر کے اسلوبِ شعر سے یہ عناصر صاف عیاں ہوتے ہیں۔اس قسم کے اشعار کہ کر شاعر تزکیہ کر کے اپنی تکلیف کا احساس کم کرتا ہے:

قائم میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا پہ حیف　　زاغ وزغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے　　(قائم)
نہیں اے مصحفی! فہمیدہ کوئی　　عبث جادو بیانی کر رہا ہوں　　(مصحفی)

ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر تعلیٰ کا مضمون نظم کرتے ہوئے اسلوب میں تبدیلی کر کے اپنی بات زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز میں سننے اور پڑھنے والوں تک پہنچاتا ہے۔تعلیٰ کے اشعار کا اسلوب شاعر کے مدعا کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ارشد سیماب ملک

اردو جریدہ نگاری اور تاریخ ساز ''رہنمائے تعلیم''

(ترمیم و اضافہ)

اخبارات و رسائل عوام کو باخبر رکھنے کے ساتھ کسی بھی معاشرے میں مذہبی، سماجی، سیاسی اور علمی و ادبی شعور اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنے عہد کے نمائندہ بھی ہیں اور مستند دستاویز بھی جو مورخین و محققین کے لیے کارگر ثابت ہوتے ہیں اور علم و ادب کی آبیاری کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

زمانہ قدیم سے دور جدید تک ذرائع ابلاغ کے مختلف طریقے رائج رہے۔ قدیم زمانے میں جب کوئی واقع رونما ہوتا یا کوئی بڑی خبر ہوتی تو اسے دوسرے علاقوں تک پہنچنے میں کئی دن لگ جاتے چوں کہ کے ان کے راوی فقیر، سادھو یا وہ مسافر ہوتے جو میلوں کی مسافت پیدل یا سست رفتار سواریوں کے زریعے طے کر کے دوسرے علاقوں تک پہنچتے۔ اسی طرح راجاوں اور بادشاہوں کو اہم واقعات سے باخبر رکھنے کے لیے تیز رفتار ہرکارے اور قاصد بھیجنے کا طریقہ رائج تھا۔ اشوک کے زمانے سے عہد مغلیہ تک بادشاہوں کے خبر رسانی کے خفیہ زرائع سے صحافت کے ابتدائی خدوخال نمایاں ہو چکے تھے۔ اس پر جناب مہدی حسن رقمطراز ہیں:

''ہندوستان میں صحافت کی ابتداء طبع شدہ اخبارات سے بہت قبل بادشاہوں کے خفیہ نویسوں اور وقائع نگاروں کی شکل میں ہو چکی تھی۔ شیر شاہ سوری نے مختلف اہم شاہراوں پر جو سرائیں

تعمیر کرائی تھیں ان میں مسافروں کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کا بندوبست تو ہوتا ہی تھا اس کے ساتھ ساتھ ہر سرائے میں ڈاک بھیجنے کا انتظام خفیہ نویس بھی تعینات ہوتا تھا۔ جو مسافروں کے قافلوں تاجروں اور دیگر آنے جانے والوں سے حاصل ہونے والی اہم معلومات سے بادشاہ کو باخبر رکھتا تھا۔ شیر شاہ کے خبریں حاصل کرنے کے ذریعوں کی کامیابی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے بنگال ایسے دور افتادہ علاقے سے بھی روزانہ اطلاعات موصول ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے تمام بادشاہوں نے خبر رسانی کی اہمیت کو اس حد تک محسوس کر لیا تھا کہ ہر اہم مقام پر ایک خبر نویس ضرور مقرر کیا جاتا تھا جو اپنے علاقے کے حالات سے بادشاہ اور وزراء کو باخبر رکھتا تھا۔،،ا

برصغیر میں طباعت کی باقاعدہ ابتدا سے ارتقا تک صحافت نے کئی مدارج طے کیے بل خصوص اردو صحافت کو بے بہا مشکلات اور صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدت کاری نے دنیا بھر میں زرائع ابلاغ کی ترسیل کا جال بچھا رکھا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، کیبل نیٹ ورک، موبائل فون، سٹیلائٹ، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زریعے معمولی سے واقعہ کی خبر بھی منٹوں میں دنیا کے ہر کونے تک پھیل جاتی ہے۔ یہی نہیں انٹرنیٹ کی حیرت انگیز ایجاد معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہے جس سے ہم دنیا بھر کی تہذیب و ثقافت، مذہب، تعلیم، ادب، صحت غرض یہ کہ ہر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق معلومات اور تفریح اپنی پسند کے مطابق حاصل کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر جہاں دنیا کے علوم وفنون کا معیاری مواد میسر ہے وہیں اردو صحافت اور زبان و ادب پر بھی مناسب پیش رفت ہو رہی ہے۔ انٹرنیٹ پر اردو کی کئی ویب سائیٹس، لائبریریاں اور بیشتر اخبارات رسائل موجود ہیں جس سے دنیا بھر میں اردو زبان و ادب اور صحافت کو نمایاں فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ تاہم اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خواجہ

اکرام اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات میں رقمطراز ہیں:

''زبان کی ترویج و ترقی کے لیے سائبر اسپیس کے استعمال کی جہاں تک بات ہے تو یہاں وسائل بے شمار ہیں اور طریقے بھی ہزار ہیں۔آڈیو، وڈیو اور ڈیجیٹل تکنیک کی مدد سے ہم ان مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔اس وسیلے کو اردو ادب اور زبان دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی بہت زیادہ گنجائشیں موجود ہیں ادب کے حوالے سے جو کام اب تک کیے گئے ہیں یا جو کچھ سائبر اسپیس میں موجود ہیں وہ تشفی بخش ضرور ہیں مگر یہ ناکافی ہیں اس میں مزید وسعت کی ضرورت ہے۔اردو ادب کی ڈیجیٹل کتب خانے، سیاسی، ادبی و تہذیبی رسالے اخبارات اور کتابوں کی مختلف سائنس موجود ہے لیکن ان میں موضوعاتی سائنس کی بے انتہا کمی ہے۔''۲

اگر ہم ماضی پر نگاہ ڈالیں تو ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' سے ہوا۔''۲۷ مارچ ۱۸۲۲ کو یہ اخبار شائع ہوا جو اردو زبان میں تھا۔لیکن اس کی یہ مدت بہت ہی مختصر سی تھی چنانچہ ۸ مئی ۱۸۲۲ء کے کلکتہ جنرل میں اعلان کیا گیا تھا کہ جس ہندوستانی اخبار کے چھ شمارے چھپ چکے ہیں اس کی زبان میں عنقریب ایک اہم تبدیلی ہونے والی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۶ مئی ۱۸۲۲ سے اس کی زبان فارسی ہو گئی تھی۔۔۔فارسی کا پرچہ ۲۳ مارچ ۱۸۲۸ء تک آٹھ صفحہ پر اردو کے ضمیمہ کے بند ہونے بعد بارہ صفحہ اور چند سال کے بعد سولہ صفحات پر مشتمل ہوا۔اردو کا پرچہ چار صفحہ پر نکلتا تھا دو کالمی تھا۔''۳ اردو خبروں کا ضمیمہ مارچ ۱۸۲۶ء تک شائع ہوتا رہا ''جام جہاں نما'' ایک طویل العمر اخبار تھا جو ۱۸۷۶ تک جاری رہا۔

مولانا محمد حسین کے والد مجاہدِ آزادی مولوی محمد باقر دہلوی نے ۱۹۳۷ میں دہلی سے اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔یہ سیاسی خبروں کے ساتھ زیور تعلیم سے بھی آراستہ

تھا اس میں مختلف تعلیمی اداروں کی خبریں، مضامین کے علاوہ ذوق، غالب، مومن اور بہادر شاہ ظفر کا کلام بھی شائع ہوتا رہا۔ دہلی کی قدیم معاشرتی زندگی میں یہ اخبار ایک نیا انقلاب بن کر ابھرا جس نے نئے نئے خیالات موضوعات اور سیاسی حالات کو دلیری سے پیش کیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جہاں ہندو، سکھ، عیسائی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا وہیں مسلمان مجاہدین اور مولوی محمد باقر ایسے محب وطن صحافیوں نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا اور خود کو اور دہلی اخبار کو اس کے لیے وقف کر دیا اور مجاہدین آزادی کے حوصلے بلند کیے۔ مولوی باقر کے انقلابی میلان کو دیکھ کر بعد میں ''اخبار اردو'' کو بہادر شاہ ظفر کے نام کی مناسبت سے ''اخبار الظفر'' کے نام سے شائع کیا گیا اور اس کے آخری دس شمارے اسی نام سے شائع ہوئے۔ اس بابت ڈاکٹر ہمایوں اشرف رقمطراز ہیں:

''شہید صحافت مولوی محمد باقر بھی میدان صحافت کے انہیں جان باز اور حق پرست سپاہیوں میں سے ایک تھے بلکہ وہ اس قبیل کے سردار و پیشوا تھے جنہوں نے اپنے اخبار'' دہلی اردو اخبار'' میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حکام کی کارکردگی پر مردانہ وار حملہ کیا کیونکہ مولوی صاحب برائی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی غلامی اور ان کے ذریعہ تھوپی گئی سامراجی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ان کا اخبار بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں جب تک پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء کا غدر) رہی اس وقت تک دہلی اردو اخبار نے اپنے صفحات جنگ آزادی کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر دیئے۔ مولانا نے اپنے اخبار میں غدر کی خبریں بڑے ہی اہتمام سے شائع کیں، جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں شائع کیں، پر جوش ولولہ انگیز باغیانہ مضامین اور نصیحتوں کو روزانہ شائع کیا یہاں تک کہ علمائے کرام کے انقلابی فتوؤں کو بھی اخبار کی زینت بنایا۔ انہوں نے اس اخبار میں روحانی بزرگوں کے خواب بھی نمایاں طور پر شائع کیے جس میں انگریزی حکومت کے خاتمے کی بشارت کا

ذکر ہوتا یعنی مجاہدین آزادی کی رگوں میں روانی خون تیز کرنے کے تمام لوازم کو اخبار میں جگہ دینا ہی دہلی اردو اخبار کا ولین مقصد تھا۔ مولانا نے اس بات کا خاص اہتمام کیا تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے مجاہدین آزادی کے دہلی آنے اوراور یہاں ان کے جنگی کارناموں، انگریزوں سے مجادلوں ومقابلوں اوران پر فتح وظفر حاصل کرنے کی رپورٹیں اوران کی تفصیل خصوصی طور پر شائع کی جائیں اور یہ بھی بتایا جائے کہ ہندوستان کے کن کن مقامات پر انگریزی فوجوں کا مجاہدین آزادی نے قلع قمع کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔شاہد یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر دہلی اردو اخبار کے چند نمبروں میں اس کا نام بدل کر''اخبار الظفر'' کر دیا گیا حالانکہ تبدیلی نام کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ اسے بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام سے مناسبت دی تھی۔''[۴]

اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں ماسٹر رام چندر نے''فوائد الناظرین''اور''محب ہند'' میں فلسفہ اور جدید علوم وفنون پر مفید مضامین شائع کر کے اردو جریدہ نگاری کو فروغ دیا۔ دہلی کے بعد جب لاہور ادبی مرکز بنا تو مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام علمی، ادبی وصحافتی خدمات انجام دیں۔سر سید احمد خان کے''سائنٹفک سوسائٹی''اورتہذیب و اخلاق نے اردو صحافت کو جدید خطوط پر استوار کیااور مسلمانوں میں ایک نئ روح پھونکی۔روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

''سر سید احمد خان نے صحافت کے زریعے برصغیر میں تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی فکر کے سانچے بدلنے اور اردو نثر و نظم کو بھر پور زندگی کا عکاس وترجمان اور رہنما بنانے کے لیے ۱۸۷۰ء میں ماہنامہ''تہذیب و اخلاق جاری کیا۔اس مجلّے میں معاشرتی، اخلاقی، تعلیمی، علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی موضوعات بالخصوص قومی اصلاح وترقی کے مسائل پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔اخبار''سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ''اور مجلہ''تہذیب و اخلاق'' کا بنیادی فرق یہ تھا کہ اولالذکر ہفت روزہ تھا اور دوسرا ماہنامہ، جس میں ہر قسم کے علمی

،اخلاقی ، مذہبی ، ادبی اور تعلیمی موضوعات پر اعلیٰ پائے کے مضامین شائع ہوتے تھے۔'' ۵

عبدالحلیم شرر، میر ناصر دہلوی ، منشی سجاد حسین ، منشی نولکشور نے اردو صحافت کو مزید مستحکم کیا۔ بیسوی صدی کے اوئل میں اردو کے علمی و ادبی رسائل و جرائد کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔شیخ عبدالقادر کے ''مخزن'' نے رومانوی تحریک کے زیرِ اثر اپریل ۱۹۰۱ء میں اپنے سفر کا آغاز کیا ۔اس نے اردو کی ترقی وترویج کا اہتمام کرنے کے ساتھ نظم ونثر کو جدید رنگ سے روشناس کیا بل خصوص افسانہ اور دیگر نثری اصناف کو وسعت دی۔ عصرِ جدید خواجہ غلام الثقلین نے جنوری ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ فروری ۱۹۰۳ء میں ''ماہنام زمانہ'' کا اجراء ہوا اس کے پہلے اڈیٹر منشی برت لال درمن تھے نومبر ۱۹۰۳ء سے اس کی ادارت کے فرائض دیا نرائن نگم نے اپنی وفات تک انجام دیئے۔ یہ اپنے دور کا مقبول رسالہ تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کا ''الندوہ'' جولائی ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ ''علی گڑھ منتھلی'' ۱۹۰۳ء میں منظرِ عام پر آیا اس کے اڈیٹر ولایت حسین تھے۔ جولائی ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ماہنامہ ''اردو معلیٰ'' جاری کیا۔ ٦ مولانا ابوالکلام آزاد نے نومبر ۱۹۰۳ء میں کلکتہ سے ماہنامہ ''لسان الصادق'' شائع کیا جو زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خان نے جولائی ۱۹۰۳ء میں دکن سے ایک رسالہ ''افسانہ'' کا اجراء کیا لیکن چند ماہ بعد جنوری ۱۹۰۴ء کو مولانا نے اسے ''دکن ریویو'' میں ضم کر دیا۔ اس رسالہ کی عمر بھی زیادہ طویل نہ رہی اور مولانا کے ریاست بدر ہونے کے ساتھ ۱۹۰۹ء میں بند ہوا جسے انہوں نے اسی سال ''پنجاب ریویو'' کے نام سے کرم آباد سے شائع کیا۔ راقم مراد آبادی کا رسالہ ''زبان'' ۱۹۰۵ء میں دہلی سے شائع ہوا بعد ازاں ۱۹۰۸ء میں دہلی ہی سے اسی نام کا رسالہ مائل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس صدی کے دوسرے مقبول پرچوں میں راشد الخیری کا رسالہ ''عصمت'' ۱۹۰۸ء ظفر الملک علوی کا ''الناظر'' ۱۹۰۹ء نوبت رائے نظر کا ''ادیب'' الہ آباد سے ۱۹۱۰ء میں جلوہ گر ہوا۔

اس صدی کی پہلی دہائی میں جو رسائل علمی و ادبی افق پر نمودار ہوئے ان میں ماسٹر جگت سنگھ کا ''رہنمائے تعلیم'' بھی شامل ہے۔ ''رہنمائے تعلیم'' کے بانی اور پہلے اڈیٹر ماسٹر جگت سنگھ کا تعلق ضلع کیمبل پور (حال) اٹک پاکستان سے ہے۔ جہاں کی ایک تحصیل پنڈی گھیب میں ۲۰ مئی ۱۸۸۵ء کو ان کی ولادت لالہ بوٹا مل کے ہاں ہوئی۔ وہ یہیں پلے بڑھے اور انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی یہیں سے حاصل کی سولہ سال کی عمر میں مقامی مونسپل بورڈ سے ورنا کیولر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے راولپنڈی سے ۱۹۰۲ء میں امتیازی نمبروں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ مالی حالات کے پیشِ نظر انہیں ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی اور جے۔ وی کے فوراً بعد ہی ضلع راولپنڈی کے نواحی علاقے گولڑہ میں ایک پرائمری سکول میں مدرس کی ملازمت مل گئی۔ یہاں انہوں نے اپنے فرائض انجام دیئے ہی تھے کہ انہیں جہلم کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا جہاں کے ایک مونسپل بورڈ ہائی اسکول میں آپ کا تقرر بحیثیت مدرس ہوا۔ یہاں آکر انہوں نے انتہائی محنت اور دیانتداری سے درس و تدریس کا کام انجام دیا لیکن صرف نو ماہ بعد اس اسکول کو بھی خیر آباد کہا اور شعبہ ءتدریس کے اعلا درجے کے حصول کے شوق میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انہوں نے مئی ۱۹۰۵ء میں ایس وی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد ایس وی کی سند لے کر آپ اپنے آبائی قصبے پنڈی گھیب تشریف لے آئے اور یہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں کچھ عرصہ خود بھی مدرس کی خدمات انجام دیں۔ خالصہ سکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ اساتذہ کو جدید اصولِ تعلیم کے تقاضوں، کارآمد مقالات، تحریکات سے انہیں باخبر رکھنے اور ان کے مطابق طلبا کو تعلیم دینے، اساتذہ کے جائز حقوق اور شکایات کو محکمہ کے حکامِ بالا تک پہنچانے کے لیے ایک ماہوار رسالہ کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ آپ نے

۱۹۰۵ء میں پنڈی گھیب ضلع کیمبلپور (اٹک) سے ایک ماہوار اردو رسالے کا اجراء کیا اس بابت آپ کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں:

''تعلیم سے فارغ ہوکر میں وطن چلا آیا اور وہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جس میں خود بھی پڑھاتا تھا۔ یہیں میں نے ۱۹۰۵ء ہی میں رسالہ رہنمائے تعلیم جاری کیا۔ اس کی ابتدائی حالت یہ تھی ۳۲ صفحات اور چھوٹی قطع کا بہت معمولی سا رسالہ تھا۔ میں اس کے خود ہی مضمون لکھتا تھا اور مسودہ خود ہی راولپنڈی لے جاتا کسی کاتب کی منت سماجت کر کے اپنے سامنے رسالہ لکھواتا۔ بازار جا کر خود ہی کاغذ لاتا اور مطبع والوں کی خوشامد کر کے خود کھڑے ہو کر چھواتا۔ چھپے ہوئے فرمے سر پر اٹھا کر پنڈی گھیب لاتا اور انہیں خود ہی فولڈ کرتا اور خود ان کے پیکٹ بنا کر اور خود ہی ان کے ٹکٹ لگا کر خود ڈاک خانہ میں دے کر آتا یعنی ایڈیٹر بھی میں ہی تھا اور منیجر بھی تھا اور چپڑاسی بھی۔'' ۶

شعبۂ تعلیم سے وابستگی کے پیشِ نظر ماسٹر جگت سنگھ نے شروع سے ہی اس رسالہ کا مزاج تعلیمی رکھا اور انہوں نے طلباء کی تعلیم و تربیت کو اپنا منشا بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے اسے شعبۂ تعلیم کی معاونت حاصل رہی اور یہ انسپکٹر ڈسٹرکٹ مدارس میر عبدالواحد کی زیرِ سرپرستی جاری ہوا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری اپنے ایک مضمون ''اردو کے چند قدیم اور نادر رسالے'' میں ''رہنمائے تعلیم'' سے متعلق رقمطراز ہیں:

''یہ ماہوار رسالہ پنڈی گھیب سے بسر پرستی جناب میر عبدلواحد ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس اٹک شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر منشی جگت سنگھ تھے۔

اس میں تعلیم سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے، جو طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید تھے۔ اس کا سائز ۸×۲۲/۱۲، صفحات ۳۰ ہیں۔ ہمارے کتب خانے میں شمارہ نمبر ۶ جلد اول، بابت ماہ جولائی ۱۹۰۶ء محفوظ ہے۔ ہندو مسلمان دونوں اس کے مضمون نگار ہیں''۔ ۷

ماسٹر جگت سنگھ نے طلباء کی تعلیم وتربیت اوران میں ادبی شعور بیدار کرنے کی اس روایت کو" رہنمائے تعلیم" میں برقرار رکھا اوران کے لیے ایک خصوصی گوشے کا اہتمام کیا جسے انہوں نے گلدستہ اطفال کا نام دیا بعد ازاں اس کا ضمیمہ بھی شائع ہوتا رہا۔ بچوں کے اس ادبی حصہ میں پاک فوج کے ایجوکیشن ڈائریکٹر، بجنگ آمد کے خالق معروف مزاح نگار کرنل محمد خان کی بارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی "بلی اور چوہا" اور شاعری کی پہلی کاوش "حمدِ خدا" بھی شائع ہوئی۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک یہ رسالہ پنڈی گھیب ضلع کیمبل پور سے شائع ہوتا رہا ۔ماسٹر جگت سنگھ ۱۹۰۷ء میں ملازمت کے سلسلہ میں جب لاہور تشریف لائے تو انہوں نے رسالہ کو پنڈی گھیب چھوڑ آنے کی بجائے لاہور ایسے تعلیمی و ادبی مرکز سے شائع کرنے کو ترجیح دی۔شروع میں انہیں مالی مسائل اور رسالہ کی ڈیکلریشن کی دقت پیش رہی لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور رسالہ کی اشاعت اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔اس سلسلہ میں وہ گاہے گاہے تعلیمی اداروں کے افسران سے مدد کے خواں رہے۔اس جدوجہد کے نتیجہ میں نہ صرف انہیں رسالہ کو جاری رکھنے کی اجازت ملی بل کہ رسالہ کی ترسیل مختلف اضلاع کے سکولوں میں ہونے لگی اور رسالہ مقبولیت اور ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ ماسٹر جگت سنگھ نے ادبی رجحانات و میلانات کو محسوس کرتے ہوئے رہنمائے تعلیم میں علمی و ادبی مضامین شائع کرنے شروع کر دیے۔ ماسٹر جگت سنگھ خود بھی علمی معلوماتی اور تعلیمی موضوعات پر دقیق مضامین لکھا کرتے۔ان کے مضامین میعار و مقدار کے اعتبار ہی سے نہیں اپنے شگفتہ اندازِ بیان اور اسلوب کے حسن و نکھار کی چاشنی سے لبریز ہوتے۔ ماسٹر جگت سنگھ کی مستقل مزاجی اور محنت سے "رہنمائے تعلیم" طویل سفر کی راہ پر گامزن ہوا،اور اس کی مجلس ادارت میں کئی اہم ادبی شخصیات شامل ہوئیں۔ ماسٹر جگت سنگھ رہنمائے تعلیم کی مشکلات

اور کامیابیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''فروری ۱۹۰۷ء میں مجھے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں ایک ملازمت مل گئی اور میں یہاں ورنیکلر ٹیچر مقرر ہو کر آ گیا اور رسالہ کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔مگر لاہور آتے ہی مجھ پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ بعض حاسدوں نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ جگت سنگھ سرکاری ملازم ہے۔اور سرکاری ملازم اپنا زاتی پرچہ نہیں نکال سکتا۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کروں،ان دنوں شمس العلماء مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین پنجاب میں انسپکٹر تعلیمات تھے اور میں نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت نیک نفس، رحمدل اور بے تعصب بزرگ ہیں۔ میں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے عرض کیا کہ اگر آپ ڈائریکٹر تعلیمات سے سفارش فرما کر مجھے رسالہ نکالنے اور جاری رکھنے کی خاص اجازت دلوا دیں تو میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔خواجہ صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ میری گزارش کو سنا اور امداد کا وعدہ فرمایا۔جس کے نتیجہ میں مجھے ڈائریکٹر تعلیمات کی طرف سے اجازت مل گئی اور میں بے فکری کے ساتھ اس کی اشاعت کرنے لگا۔ میں نے محنت اور دیانت کے ساتھ کام کیا۔قدرت نے فیاضی کے ساتھ میری مدد کیا ور رسالہ چل نکلا رسالہ کی اشاعت میں لالہ نارئین مہر رپورٹر آن بکس پنجاب میں بھی میری قابل قدر امداد کی اور رسالہ تمام پنجاب کے سکولوں میں جانے لگا اور دن بدن ترقی کرنے لگا۔اس کی اشاعت ہزاروں تک گئی اور اس کے کئی خاص نمبر بڑی شان سے میں نے نکالے۔عام نمبر بھی میں نے دو دو سو صفے کے شائع کیے۔۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۲ء تک طالب علی پابند بحثیت اڈیٹر میرے ساتھ کام کرتے رہے پھر چھمی چند صاحب دوبار تھی بی۔اے۔بی۔ٹی۔ایم۔آر۔ایس بطور آنریری اڈیٹر کام کرتے رہے اور ان کے ساتھ بعض دوسرے اصحاب بھی میری امداد کرتے رہے۔۱۹۳۰ء کے بعد حضرت جوش ملسیانی حصہ نظم کے انچارج اور شیخ محمد اسمائیل پانی پتی

حصہ نثر کے اڈیٹر ہوئے اور اس وقت تک یہ سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ میں ممنون ہوں ان دونوں صاحبوں کا کہ وہ آنریری طور پر اتنے عرصہ دراز سے میری قلمی امداد کر رہے ہیں ۔۱۹۳۱ء میں میں نے اپنے رسالہ کا پچیس سالہ جوبلی نمبر نہایت نفاست اور شان کے ساتھ شائع کیا اور میں نے کوشش کی کہ اس وقت کے تمام مشہور اہل قلم اس میں اپنے بہترین مضامین لکھیں ۔ میری توقعات کامیاب ہوئیں اور میں بڑے سائز کے ۳۸۷ صفحات کا ایک ضخیم پرچہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکا جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور بیس پچیس سال تک یہ ریکارڈ قائم رہا۔ پر یہاں تک کہ رسالہ نقوش کے جہازی نمبر شائع ہونے لگے جس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بعد کے ایام میں میں نے بہت ہی نفاست اور عمدگی کے ساتھ فسانہ نمبر، ریڈ کراس نمبر، سلور جوبلی نمبر، اور تاجپوشی نمبر، بڑی آب و تاب سے آرٹ پیپر پر شائع کیے۔ جو بہت کافی مقبول ہوئے ان میں سے ریڈ کراس نمبر اتنا پسند کیا گیا کہ اس پر سرکار انگریزی نے مجھے ''سردار صاحب'' کا خطاب دیا اوپر کے یہ چاروں نمبر شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے بڑی محنت سے مرتب کیے تھے۔''۸

ماسٹر جگت سنگھ اردو زبان سے بے پناہ محبت کرنے والے ایک روشن خیال ادیب اور معلم ہونے کے ساتھ اصول پسند اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر تعصّبات سے بالاتر ہو کر فلاح علم اور اردو کی خدمت میں بسر کی۔ ماسٹر جگت سنگھ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ۳۱ سال درس و تدریس سے وابسطہ رہنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے خود کو خدمتِ خلق کے لیے مصروف کر لیا لیکن اس کے باوجود ''رہنمائے تعلیم'' کی مسلسل اشاعت کو اپنا مقصدِ حیات بنائے رکھا۔ ان کی ادب پروری اور کاوشوں پر امام مرتضیٰ نقوی رقطراز ہیں:

''ادب حقیقی معنوں میں کسی قوم کے تمدنی اور ثقافتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے اس کے بغیر

نہ تعلیم مکمل ہوسکتی ہے نہ ہی معاشرے میں کسی قسم کا انقلاب لایا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی رسالہ تعلیمی ہو یا کسی اور قسم کا وہ ادب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ ماسٹر جگت سنگھ نے بھی اپنے رسالے میں اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ عرصے کے بعد علمی و ادبی مضامین بھی شائع کرنے شروع کیے، چنانچہ دستورالاصلاح کے خلاف ابرار حسنی گنواری نے ایک طویل سلسلہ مضامین شروع کیا۔ جو کئی برس تک رسالے میں جاری رہا۔ بعد میں ان مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں اصلاح الاصلاح کے نام سے شائع کر دیا۔ صابر الہ آبادی نے عروض جیسے فن پر مسلسل کئی برس تک مضمون لکھے۔ ایک مرتبہ اسی رسالے میں ساحل اور لبِ ساحل پر بحث شروع ہوئی اور اس میں کئی حضرات نے حصہ لیا۔ یہ بحث بڑی دل چسپ تھی اس میں سب سے نمایاں حصہ جناب قیصری فیروز پوری کا تھا۔ رہنمائے تعلیم نے حضرت دل شاہجہانپوری کے بارے میں ایک خاص نمبر شائع کیا۔ جس میں ان کی ادبی، علمی اور فنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی۔ اور اس وقت کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے دل شاہجہانپوری کے فن اور شاعری پر مضمون لکھے۔ یہ نمبر بہت مقبول ہوا ۔اس کے علاوہ ماسٹر جگت سنگھ نے سلور جوبلی نمبر، ماتم نمبر، تعلیم جدید نمبر، تاجپوشی نمبر، ریڈ کراس نمبر، تپ دق نمبر، گگھڑ نمبر، وکٹری نمبر، گاندھی نمبر، انسانیت نمبر، معلوماتی نمبر، فلم نمبر، کشمیر نمبر، افسانہ نمبر وغیرہ شائع کیے۔ افسانہ نمبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا جس کی ضخامت پانچ سو صفحات تھی۔ اس میں ایک مضمون ''افسانہ نویسی کا فسانہ'' شائع ہوا یہ سب سے پہلا مضمون ہے جس میں افسانہ نویسی کی ایک نہایت جامع اور تفصیلی تاریخ ہے۔ یہ پرچہ مذہبی تنگ نظری اور قدامت پرستی کے خلاف اور آزاد خیالی کا نقیب تھا۔ اس لیے تمام نئے اور پرانے مصنفین اور شعراء کا محبوب پرچہ بن گیا۔ موضوعات کے متنوع ہونے سے اس پرچے کا حلقہ بھی خاص وسیع تھا۔ مولانا حسن نظامی، پریم چند، عشرت لکھنوی، دیا نرائن

نگم، حکیم یوسف حسن اور شیخ اسمٰعیل پانی پتی جیسے لائق اور صاحبِ طراز نثر نگاروں کے علاوہ ریاض خیر آبادی، جلیل مانک پوری، دل شاہجہانپوری، باسط بسوانی، طالب الہ آبادی، نوح ناروی، جگر مراد آبادی، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی اور صوفی تبسم جیسے عظیم شعراء کی قلمی معاونت اس رسالہ کو حاصل رہی۔''۹

ماسٹر جگت سنگھ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے مزید تعلیم حاصل نہ کی۔ وہ ملازمت کے سلسلہ میں جب لاہور آئے تو ان کی مالی حالت بہت خراب تھی ابتدائی عرصہ انہوں نے انتہائی تنگ دستی میں گزارا لیکن رسالہ کی کامیابی و مقبولیت سے نہ صرف حالات بہتر ہوئے بل کہ ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں شہرت پائی۔ سر سکندر حیات خان پریزیڈنٹ ریڈ کراس سوسائٹی وزیر تعلیم گورنر پنجاب و یسرائے ہند اور جارج پنجم کی جانب سے انہیں تعریفی خطوط موصول ہوئے جس میں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ رسالہ کو عروج ملنا تھا کہ ان کی مالی حالت اس قدر بہتر ہوئی کہ اپنا کتب خانہ قائم کر لیا اور ایک ہینڈ پریس بھی لگا لیا جس میں باقاعدہ طور پر کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا جس سے ان کی آمدنی میں اضافے سے انہوں لاہور ایسے شہر میں چار منزلہ مکان بنا لیا۔ تقسیمِ ہند پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے خاندان کے ہمراہ دہلی چلے آئے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے ''رہنمائے تعلیم'' کو اسی محنت اور لگن سے جاری رکھا۔

رہنمائے تعلیم کی کامیابی میں ماسٹر جگت سنگھ کے ساتھ کئی دوسرے اصحاب کی محنت اور امداد کا ثمر بھی شامل ہے۔ ان میں اس وقت کے انسپکٹر تعلیمات پنجاب فرزندِ مولانا حالی جناب خواجہ سجاد حسین شامل ہیں جنہوں نے ماسٹر صاحب کو رسالہ جاری رکھنے کی اجازت دی، لالہ سورج نارائن مہر رپوٹر پنجاب اس رسالے کے امداد گزاروں میں شامل ہیں۔ رہنمائے تعلیم کے دوسرے اڈیٹر منشی طالب علی پابند تھے جن کی محنت اور لگن نے رسالے کو پروان چڑھایا

منشی صاحب کو زمانہ طلب علمی ہی سے شعر گوئی سے علاقہ رہا۔ وہ اس رسالہ کی ادارت سے قبل بھی صحافت کا تجربہ رکھتے تھے انہوں نے ۱۹۰۸ء سے اپریل ۱۹۲۲ء تک مسلسل ۱۴ سال رہنمائے تعلیم میں ادارتی خدمات انجام دیں۔ منشی طالب علی پابند نے جب اپنا اخبار نکالا تو ان کے بعد ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۰ء تک کے دوانیہ میں پچھمی چند ودیارتھی، لالہ آ گیا رام سچدیوا، ابوالمعانی سید محمد دین نوگانوی اور طالب کاشمیری نے رہنمائے تعلیم کی ادارتی خدمات انجام دی۔ ۱۹۳۰ء میں جوش ملسیانی نے حصہ نظم کے ادارتی فرائض سنبھالے۔ ایک اور معروف ادبی شخصیت حضرت داغ دہلوی کے شاگرد اور جانشین جناب نوح ناروی اس رسالہ کے سرپرست رہے۔ آپ بھوائی پور ضلع رائے بریلی (اودھ) میں ۱۸۷۹ء کو اپنے نانا کے ہاں پیدا ہوئے۔ عربی وفارسی کی تعلیم میر نجف علی سے حاصل کی شعر گوئی کا شوق انہیں کی صحبت میں ہوا، اور ابتدائی طور پر انہیں سے اصلاح لی اس کے بعد جناب امیر مینائی لکھنوی اور پھر جلال لکھنوی سے چند غزلوں پر مشورہ لیا لیکن ان کی تشفی نہ ہوئی اور بلا آخر حضرت داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور ان سے فارغ الاصلاح ہوئے۔ نوح ناروی کی وفات کے بعد رسالہ کی سرپرستی جوش ملسیانی نے فرمائی۔ جوش صاحب نے بھی جناب داغ دہلوی کا تلمذ اختیار کیا اور تین تک سال اُن سے شرف فیض حاصل کیا۔ آپ طویل عرصہ رہنمائے تعلیم سے وابسطہ رہے اس بابت رقمطراز ہیں:

''۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کے شعبہء ادبیات کا مدیر بھی رہا ہوں۔ اب یہ رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ حضرت نوح ناروی اس کے سرپرست تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس کی سرپرستی مجھے سونپ دی گئی۔''۱۰

جوش ملسیانی کے علاوہ شیخ اسماعیل پانی پتی بھی ۱۹۳۰ء میں رہنمائے تعلیم کے ساتھ اعزازی طور پر منسلک ہوئے ماسٹر جگت سنگھ نے انہیں حصہ نثر کے ادارتی فرائض سونپے

جو وہ بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ان دونوں شخصیات کی شمولیت نے رہنمائے تعلیم کو عروج بخشا۔ماسٹر جگت سنگھ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء میں آنجہانی ہوئے تو شیخ اسماعیل پانی پتی یہ فرائض اُن کے فرزند ہر بھجن سنگھ تھاپر کے ساتھ مل کر نبھاتے رہے اس بارے میں شیخ اسماعیل پانی پتی رقمطراز ہیں:

۱۹۳۰ء میں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے میرا ادارت کا تعلق قائم ہوا۔جو آج تک ۳۴ برس ہو چکے ہیں قائم ہے۔یہ رسالہ آج کل میری ادارت میں دہلی سے نکل رہا ہے۔رسالہ کے مالک اور بانی سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ تو فوت ہو چکے ہیں۔ان کے لائق فرزند سردار ہر بھجن سنگھ تھاپڑ یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔میری ادارت میں رسالہ ہذا کے بعض خاص نمبر بڑی شان سے شائع ہوئے ہیں۔''۱۱

ماسٹر صاحب کی وفات کے بعد ''رہنمائے تعلیم'' کی ذمہ داری کے فرائض ان کے بیٹے ہر بھجن سنگھ تھاپر نے سنبھال لیے جو ۱۹۳۹ء سے اپنے والد ماسٹر جگت سنگھ کے ساتھ پرچہ کی معاونت میں شامل رہے۔ہر بھجن سنگھ تھاپر ۱۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔انہوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ہائی اسکول،سیکر یٹریٹ کورس وائی۔ایم۔سی۔اے لاہور سے،آنرز ان پنجابی (پرشین سکرپٹ) پنجاب یونی ورسٹی سے کیا۔کچھ عرصہ پنجاب سیکر یٹریٹ (آئی جی پرزنز ڈیپارٹمنٹ) میں کام کیا۔۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۲ء تک اپنے علاقہ میں کونسلر کے ساتھ سماجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔وہ سٹی ایریا کمیٹی کے ممبر،نیشنل ڈیموکریٹک کمیٹی اور میئر کونسل فار نیشنل ڈیفنس سوئیوالان وارڈ کے ممبر رہے۔اور رسالے کے زریعہ اخلاقی،تعلیمی،ادبی وصحاتی خدمات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔انہیں علمی،ادبی اور صحافتی خدمات پر کئی ایوارڈ سے نوازا گیا۔اردو اکیڈمی دہلی ایوارڈ ۲۰۰۰ (برائے بچوں کا ادب)،بزم ادب رام پور ایوارڈ ۲۰۰۱،ایوارڈ بزم مکیش

آگرہ ۲۰۰۳،اعزاز بزرگ صحافی اردو اکیڈمی دہلی برائے طویل مدتی صحافی خدمات ۲۰۰۴۔

ہربھجن سنگھ تھاپر نے رسالہ کے مالکانہ حقوق کو بروئے کار لایا اور اپنے والد ماسٹر سنگھ جگت کی طرح محنت اور لگن سے ''رہنمائے تعلیم کو جاری رکھا اور'' نوح ناروی نمبر'' ''پنڈت جواہر لال نہرو نمبر'' ''مبشر علی صدیقی نمبر'' ''سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ نمبر'' ''کالی داس گپتا رضا نمبر'' اور حضرت بیدل بیکاری کی شخصیت وفن پر خاص نمبر شائع کیا۔اور سب سے بڑا اعزاز جو انہیں حاصل ہوا وہ اس تاریخ ساز رسالہ'' رہنمائے تعلیم'' کا صدی نمبر ہے۔جو انہوں نے نومبر ۲۰۰۵ میں دہلی سے شائع کر کے اردو صحافت میں طویل العمر ماہنامہ ہونے کی تاریخ رقم کی۔

بیسویں صدی میں اردو صحافت نے گونا گوں ترقی کی بل خصوص ادبی جریدہ نگاری کی روایت نہ صرف توانا اور مستحکم ہوئی بل کہ اس نے جدید تر رجحانات کو بھی جنم دیا تاہم مختلف نظریات اور تحریکوں کے زیرِ اثران میں تصادم کی صورت بھی نمایاں رہی۔آزادی سے پہلے اور بعد میں سینکڑوں رسائل ادبی افق پر نمودار ہوئے ان میں بیشتر اقتصادی مسائل کی نظر ہو کر مختصر عرصہ میں بند ہوئے ۔دور حاضر میں بھی اپنی مدد آپ کے تحت جاری ہونے والے ادبی جرائد کو یہی المیہ درپیش ہے باوجود اس کے علم وادب کے رسیا اپنے حصے کی شمع جلا رہے ہیں۔گزشتہ صدی سے رواں صدی تک ''مخزن'' ''زمانہ'' ''علی گڑھ منتھلی'' ''اردو معلیٰ'' ''رہنمائے تعلیم'' ''عصمت'' ''ہمایوں'' ''فانوس خیال'' ''ادبی دنیا'' ''نیرنگ خیال'' ساقی'' ''ادب لطیف'' ''کہکشاں'' ''نگار'' ''شاعر'' '' ادیب'' ''تحریک'' ''نیا ادب'' ''افکار'' ''آج کل'' ''سویرا '' ''نیا دور'' ''اردو'' ''شاہکار'' ''سب رس'' ''فکر ونظر'' ''ماہ نو'' ''نقوش'' ''قومی زبان'' ''فنون'' ''اوراق'' ''نئی قدریں'' ''معاصر'' ''لیل ونہار'' ''صحیفہ'' ''شعور'' ''روشنائی'' ''ادبیات''

"سیپ" "تخلیق" "طلوع افکار" "کلاسیک" "چہارسو" "جہان ادب" "شب خون" "اقدار" "آئندہ" "جدید ادب" "عالمی اردو ادب" "تحریر" "فکر و تحقیق" "روح ادب" "تجدید ادب" ایسے کئی معتبر جرائد نے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ان میں سے کئی طویل العمر رسائل اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں۔برصغیر کی تابناک صحافت پر پاک و ہند میں مختلف موضوعات پر بے شمار کتب لکھی گئیں لیکن رسائل و جرائد کی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا تاہم ہندوستان میں مولانا امداد صابری نے اردو صحافت کی ایک جامع تاریخ مرتب کی جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔انہوں نے رہنمائے تعلیم کو ۱۹۰۶ء کے رسائل میں شمار کیا اور اولین پرچہ کا سنِ اشاعت ۱۹۰۶ء درج کیا جو غلط ہے۔امام مرتضیٰ نقوی نے بھی "اردو ادب میں سکھوں کا حصہ" میں رہنمائے تعلیم کا مقامِ اجراء لاہور اور سنِ اشاعت ۱۹۰۷ء غلط درج کیا۔اردو صحافت کی تاریخ پر لکھی گئی دیگر کتب میں رہنمائے تعلیم ایسے تاریخ ساز پرچہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔پاکستان میں اردو صحافت کی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا اس کمی کو اکادمی ادبیات پاکستان اور مقتدرہ قومی زبان ایسے ملکی اداروں نے بھی شدت سے محسوس کیا۔اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکادمی ادبیات پاکستان نے نامور محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر انور سدید کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے انتہائی جانفشانی سے "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" مرتب کی جسے اکادمی نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔اس سے قبل مقتدرہ کی جانب سے چند دیگر کتب اردو صحافت پر جلوہ افروز ہوئیں۔لیکن "رہنمائے تعلیم" تذکرے سے محروم نظر آتا ہے۔جناب ڈاکٹر انور سدید نے "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا اور اردو جریدہ نگاری کی ابتدا سے ۱۹۸۸ء تک روشنی ڈالی۔انہوں نے اردو ادب کے عہد ساز رسائل "اردو" "ہمایوں" "نگار" "نیرنگ خیال" "ادبی دنیا" "ساقی" "ادبِ لطیف" "افکار" "سویرا" "نیا دور" "سب رس" کے علاوہ خواتین کے رسائل، طنز و مزاح، تعلیمی اداروں، ادبی ڈائجسٹ اور روزنامہ کے اخبارات کے ادبی اڈیشن کا بھی احاطہ کیا انہوں نے بیسویں صدی کے

آغاز سے تقسیم تک متعدد رسائل کا تذکرہ کیا مگر دہلی کے بعد اردو صحافت اور علم و ادب کے دوسرے بڑے مرکز لاہور سے ۱۹۰۷ء تا ۱۹۴۷ء یعنی مسلسل چالیس سال شائع ہونے والا ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' ان کی نگاہِ ناز سے بھی اوجھل رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب اس کتاب کا منصوبہ شروع کیا تو اس وقت مجموعی طور پر ''رہنمائے تعلیم'' کی عمر تقریباً اکیاسی برس ہو چکی تھی۔ لیکن یقیناً اس کی وجہ ہمارے کتب خانوں میں اس رسالہ اور اس جیسے دیگر بے شمار قدیم رسائل کی فائلز کی عدم دستیابی ہے' 'رہنمائے تعلیم'' گزشتہ ایک صدی سے اردو کی خدمت میں مصروف عمل رہا اور ۲۰۰۷ء سے ابونعمان ''رہنمائے تعلیم جدید'' کے نام سے اس رسالہ کو چلا رہے ہیں۔

رہنمائے تعلیم ہربھجن سنگھ تھاپر کی وفات تک جاری رہا۔ ہربھجن سنگھ تھاپر کے بعد ان کے ورثاء نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر گزشتہ کئی سال سے ابونعمان کی رہنمائے تعلیم سے وابستگی نے اس رسالے کو بند نہیں ہونے دیا۔ تادمِ تحریر یہ رسالہ ''رہنمائے تعلیم جدید'' کے نام سے دہلی سے ابونعمان کی زیرِ ادارت شائع ہو رہا ہے۔ ایک صدی سے زائد اردو کی خدمات انجام دینے والے اپنے دور کے اس مقبول رسالہ کو محققین و ناقدین کی عدم توجہ سے تذکروں میں محرومی کا سامنا رہا اور وہ پزیرائی تو نہ مل سکی جو دیگر علمی و ادبی رسائل کو حاصل ہوئی تاہم مقامی حلقوں میں اب بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ۲۲ جنوری ۲۰۱۴ء کو ابوالفضل انکلو دہلی میں یوم اردو کے بانی حکیم سید احمد اور ابونعمان مدیر انتظامی ''رہنمائے تعلیم جدید'' کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی اس تقریب کے روحِ رواں بزرگ صحافی سید منصور آغا تھے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کے اردو زبان اپنے الفاظ، محاوروں، اصطلاحوں اور ادبی سرمائے کے اعتبار سے مالا مال ہے۔ تاہم زبانِ اردو سے بعض سیاسی وجوہ پر تعصب برتا جاتا رہا لیکن اس سے محبت کرنے والے ہر خطے میں موجود ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال

کے یوم پیدائش کو یوم اردو کے طور پر منانے کی طرح ڈالنے کے لیے حکیم سید احمد خان کی اور ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' کو جاری رکھنے پر جناب ابونعمان کی کاوش کو سراہا۔

اسی سال ۹ نومبر ۲۰۱۴ کو شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا یومِ پیدائش دنیا بھر میں یوم اردو کے طور پر منایا گیا اس موقع پر عالمی اردو آرکنائزنگ کمیٹی نئی دہلی، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم نے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین دہلی میں ایک روزہ سمینار منعقد کیا پرگرام کی صدارت ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کی۔ وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود دہلی اردو اکادمی، پروفیسر ابن کنول صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ،سابق صدر شعبہ اردو جامع ملیہ اسلامیہ اور دیگر علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ ایک نشست میں سید منصور آغا ،مصوم مراد آبادی، مولانا ارشد سراج الدین مکی اور محمد عارف اقبال نے ''اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا اس موقع پر عالمی یوم اردو کی مناسبت سے ماہنامہ اردو رہنمائے تعلیم جدید کا خصوصی شمارہ (گوشہ بابائے اردو مولانا عبدالحق) کا اجراء عمل میں آیا۔ سمینار میں رسالہ ''رہنمائے تعلیم'' کی ایک صدی پر محیط صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

میرے لیے اس تاریخ ساز رسالہ ''رہنمائے تعلیم'' میں دلچسپی و تفاخر کی وجہ اس کا مقامِ اجراء ہے کیوں کہ اس کی جڑیں ہمارے ضلع بل کہ اس خطہء پاکستان سے پھوٹیں۔ اور رہنمائے تعلیم سے رہنمائے تعلیم جدید تک کے سفر پر یہ پہلا باقاعدہ مضمون ہے بل خصوص پاکستان میں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یکسر نظر انداز کیے جانے والے اردو کے اس تاریخی رسالہ اور اس جیسے دیگر گم نام قدیم رسائل بشمول ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' کے بعد منظر عام پر آنے والے رسائل پر اکادمی اور مقتدرہ ایسے قومی اداروں کو تفصلی کام کا بیڑا اٹھانا چاہیئے تا کہ پاکستان کے رسائل پر ایک جامع تاریخ مرتب ہو سکے۔

حوالہ جات:

۱۔مہدی حسن، جدید ابلاغ عامہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۰ء ص ۸۳
۲۔خواجہ اکرام ڈاکٹر، اردو زبان کے نئے تنکیی وسائل اور امکانات، مکتبہ جامع لمیٹڈ نئی دہلی، دسمبر ۲۰۱۲ء ص ۲۴
۳۔امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، دہلی ۱۹۵۳ء ص ۶۲، ۶۳
۴۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف، اردو صحافت: مسائل اور امکانات (حسن مثنیٰ، مضمون، دہلی اردو اخبار اور تحریک آزادی) مطبوعہ دہلی، ۲۰۰۶ ص ۳۱۹
۵۔روشن آرا راؤ، مجلّاتی صحافت کے ادراتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۹ء ص ۱۸
۶۔محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر شمارہ ۲) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۴۵۶
۷۔معین الدین عقیل ڈاکٹر، منتخبات اخبارِ اردو (محمد ایوب قادری ڈاکٹر، مضمون، اردو کے چند قدیم اور نادر رسائل) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء ص ۴۴۶
۸۔محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر شمارہ ۲) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء صفحہ، ۵۷، ۱۴۵۶
۹۔امام مرتضیٰ نقوی، اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، امروہہ اتر پردیش، ۱۹۷۰ء ص ۲۳۹
۱۰۔محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر شمارہ ۲) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۱۳۴
۱۱۔ایضاً ص ۱۷۸۵

دیگر ماخذ

امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد چہارم، صابری اکیڈمی چوڑی ولان دہلی ۱۹۷۴ء
انور سدید ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (ابتدا تا ۱۹۸۸ء) اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء
احمد سمیع ڈاکٹر، اردصحافت اور تحریک آزادی، موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۹ء
محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء

ہربھجن سنگھ تھاپر، رہنمائے تعلیم (صدی نمبر) نومبر ۲۰۰۵ء دہلی

محمد اسماعیل صدیقی بریگیڈئر (شخصیت اور فن کرنل محمد خان) اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد

ZAFAR UL ISLAM ,THE MILLI GAZETTE, JAMIA NAGAR NEW DEHLI 2005

سید منصور آغا، قومی آواز، دہلی ۲۰۱۴ء

محمد یحییٰ دہلوی، ایشاء ٹائمز، رام لیلا میدان ترکمان گیٹ دہلی ۲۰۱۴ء

محمد حمید شاہد (فکشن نگار، نقاد)　　　　انٹرویو: سید نصرت بخاری

فکشن کے باب میں ایک مکالمہ

سوال: کیا افسانہ اتنا ہی آسان ہے کہ جو شخص، چاہے وہ شاعر ہو، محقق یا عام آدمی، جس وقت چاہے افسانہ لکھنا شروع کر دے؟

محمد حمید شاہد: آپ کا سوال دلچسپ ہے اور شاید اس کا مختصر ترین جواب ''ہاں'' بھی ہے اور ''نہیں'' بھی۔ آپ میرا یہ مختصر جواب سن پر کھلکھلا کر ہنسے ہوں گے، میں نے آپ کا سوال پڑھا تو میرا پہلا ردعمل بھی یہی تھا مگر جب اس پر سوچنے لگا تو یہی جواب سوجھا، جو عرض کر دیا ہے۔ صاحب! ہے نا عجب بات، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب آپ اندر سے اتنے تیار ہو چکے ہوتے ہیں؛ پکے ہوئے رس بھرے پھل کی طرح، جس کا مزید اپنی شاخ سے لٹکے رہنا ممکن نہیں رہتا، تو افسانہ بہت سہولت سے کاغذ پر اُترتا ہے۔ لیکن جب آپ زور زبردستی اسے لکھنا چاہتے ہیں واقعات کی چولیں واقعات پر بٹھاتے ہوئے تو یہی عمل مشقت ہو جاتا ہے۔ آپ کا سوال یہی تھا کہ ایک تخلیق کار کے لیے افسانہ لکھنا مشکل ہے یا آسان؟ شاید نہیں۔ میں پھر آپ کا سوال دیکھتا ہوں تو لگتا ہے آپ سوال پوچھنے سے کہیں زیادہ، مجھے اس غصے کی جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو بس کی پڑیا بنا کر آپ نے سوال کے اندر رکھ چھوڑا ہے۔ غصہ تھو کیے صاحب، جو افسانہ لکھنے کی جانب خلوص سے بڑھتا ہے وہ عام آدمی کہاں رہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں قمر جمیل نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ اُنھوں نے طالب علمی کے زمانے میں جو افسانے لکھے تھے انھیں عزیز احمد نے مبارکباد کا تار بھیج کر سراہا تھا۔ گویا افسانہ لکھتے ہی وہ ایک عام طالب علم نہیں رہی تھیں۔ دیکھیے

،افسانہ لکھنا ایک تخلیقی عمل ہے اور جو شخص فکشن کی فضا میں رہتا ہے، اس پر تخلیق کے لمحے بہ سہولت مہربان ہو سکتے ہیں۔ اب رہا آپ کا اعتراض یا غصہ کہ یہ عطا شاعروں، محققوں اور عوام پر کیوں؟ صاحب! ذرا معاملہ اوندھا کر دیکھتے ہیں، ذرا سوچیے کہ ایک تخلیق کار ہے ،جی ایسا ویسا نہیں بلکہ بہت اچھا اور بھاگوں بھرا تخلیق کار، جب وہ تخلیقی لمحوں سے نکل جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے، وہی نا جسے انگریزی میں کہتے ہیں ''رائیٹرز بلاک'' کے مرض کا شکار۔ تو کیا ایسے لمحوں میں وہ عام آدمی نہیں ہو جاتا؟ ہو جاتا ہے نا؟ رہا معاملہ محققین اور ناقدین کا تو اُنھوں نے بھی متن میں اپنے اپنے شعبوں سے کچھ نہ کچھ لے کر افسانے کا جزو بنانے کا ہنر سیکھ لیا ہے اور جہاں جہاں وہ اس متن میں پہلے سے موجود متن کا سلیقے کا ٹانکا لگا لیتے ہیں؛ محض چونکانے یا مرعوب کرنے کو نہیں، آپ کی بے سدھ پڑی حسوں کو بھی بیدار کرنے کے لیے، تو جانیے کہ وہ فن بنا لیتے ہیں؛ نہیں تو وہ بھی منجی پیڑھی ٹھوکنے والا ہنر رہتا ہے۔ ویسے منجی پیڑھی ٹھوکنے والا عمل اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ سوچ سوچ کر لکھنا اور دوسرے متون کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر کہانی کا حصہ بنانا کہانی کے بیانیے میں رخنے ڈال سکتا ہے اور یہی عمل اگر ایک بہاؤ میں متن کا حصہ ہو جائے تو کہانی میں معنی کی کئی سطحیں رکھ سکتا ہے۔ سوچ سوچ کر لکھنے کی بات ہوئی تو یہ دھیان راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کے درمیان ہونے والے ایک دلچسپ مکالمے کی طرف چلا گیا ہے۔ وہی مکالمہ جو ''راجندر سنگھ بیدی سے ایک ملاقات'' کے عنوان سے شمس الحق عثمانی کی مرتبہ کتاب ''باقیات بیدی'' میں موجود ہے۔ اس انٹرویو میں بیدی نے بتایا تھا کہ وہ منٹو کی یہ بات کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے وقت سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد سوچتے ہو، سمجھ گئے تھے کہ منٹو کے نزدیک افسانے کی یہ کمزوری تھی اس کے بہاؤ میں رخنے پڑیں۔ ان ہی کے الفاظ میں اس طرح کی کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہو جاتی ہے۔ افسانہ لکھنا محض تیکنیک یا مزدوری نہیں ہے یہ

ایک تخلیقی عمل ہے اور اس میں کرداروں کو ایک آزاد فضا چاہیے ہوتی ہے۔ میلان کنڈیرا کا کہا یاد آتا ہے یہی کہ ”فکشن لکھتے ہوئے، کہانی کے کرداروں کو مکمل آزادی دی جانی چاہیے، یوں کہ مصنف، اپنے خیالات کے ساتھ وہاں سے بالکل الگ تھلگ رہے، غائب رہے۔“ اچھا وہ جو منشایاد نے کہہ رکھا ہے کہ لکھتے ہوئے میں اپنے کرداروں کی کھال میں بیٹھ جاتا ہوں، تو یہ بات بظاہر کنڈیرا کی کہی ہوئی بات کا تضاد ہو جاتی ہے اور اسے رد کرتی ہے یعنی مصنف کی اتنی موجودگی کہ وہ اس کی کھال میں بیٹھ جاتا ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اپنے کرداروں کی کھال اوڑھ لینا دراصل اپنے وجود کی نفی ہے۔ لکھنے والے کے وجود کی نفی۔ جب کنڈیرا یہ کہتے ہیں کہ مصنف کی موجودگی قاری کو پریشان کر سکتی ہے۔ تو وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قاری مصنف کو نہیں دیکھنا چاہتا نہ اس کے خیالات جاننا چاہتا ہے، بلکہ وہ کہانی کے بہاؤ کا اسیر ہو کر ایک التباس میں آجاتا ہے اور اسے حقیقت سمجھ رہا ہوتا ہے۔ یہ باتیں میلان کنڈیرا نے کرسچن سالم سے گفتگو میں کہی تھیں جو اُن کی کتاب ”ناول کا فن“ کا حصہ میں موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ طیش جو آپ کے سوال سے چھلک پڑا، اِس پر نہ تھا کہ ایک عام آدمی یا محقق افسانہ کیوں لکھنے لگا ہے بلکہ شاید اس پر تھا کہ وہ خرابیاں جو فکشن کے تخلیقی عمل سے افسانہ لکھنے والوں کے ہاں در آئی ہیں، اُنہیں نشان زد کیوں نہیں کیا جا رہا، میرا خیال ہے وہ کسی حد تک اوپر نشان زد ہو گئی ہیں۔ آپ کے سوال میں شاعر کا حوالہ آیا تھا مگر ادھر دھیان نہ دے پایا۔ اب اگر ایک شاعر نے ایک روشن صبح اٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اسے افسانہ لکھنا چاہیے اور وہ لکھنے بیٹھ گیا تو اس پر آپ کے ماتھے پر تیوری کیوں چڑھی؟ میں اس بابت تخمینے لگاتا ہوں تو یہی سوجھتا ہے ہو نہ ہو آپ ایک شاعر اور ایک افسانہ نگار کے ہاں تخلیقی عمل کی کارکردگی کو بالکل الگ کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں سمجھتا ہوں آپ درست درست سوچ رہے ہیں۔ دیکھئے افسانے میں زمان اور مکان سے جڑ کر

رہنا بہت بنیادی تقاضہ ہے۔ میں کہتا آیا ہوں کہ افسانے کا متن ایک سے زیادہ سطحوں پر بُنا جاتا ہے۔ خارجی سطح ایک واقعہ کے دوسرے واقعہ سے جڑ کر بنتی ہے جب کہ باطن میں اِحساس اور معنیات کے دھارے بہہ رہے ہوتے ہیں۔ بیانیے کو مختلف سطحوں پر برتنے کے لیے لازم ہے کہ زبان کی کارکردگی نگاہ میں رہے۔ لگ بھگ ایک سے معنی دینے والے الفاظ کسی جملے میں استعمال کے قرینے سے اپنا مزاج بدل لیا کرتے ہیں۔ لفظوں کی صوتیات کو نگاہ میں رکھ کر اور ایک جیسی اصوات کو دہرانے سے جملے کا آہنگ بدلا جا سکتا ہے۔ اور ایسا شاعری میں بھی ہوتا ہے مگر میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ افسانے میں فکشن کا جملہ ہی استعمال ہونا چاہیے۔ شاعرانہ وسائل کا کثرت سے استعمال بیانیہ کم زور کر دیا کرتا ہے۔ شاعر آرائشی زبان لکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ فکشن کی تخلیقی زبان اور آرائشی زبان کا اہتمام دونوں مختلف وظیفے ہیں۔ آرائشی زبان شاعری کے لیے مفید ہوسکتی ہے، مگر افسانہ نگار کا منصب یہ ہے کہ وہ ایسی زبان کا اسیر نہ ہو۔ افسانے کی زبان کو افسانے کے تخلیقی بہاؤ کے زیر اثر ہی رہنا چاہیے۔ آپ کے چھوٹے سے سوال میں، جو زہر بھرا ہوا تھا، اس نے مجھے بہت اُلجھایا ہے تاہم صاف لفظوں میں مجھے کہنا یہ ہے کہ، ہم افسانہ نگاری کو آسان یا مشکل ہونے کی کسوٹی پر کیوں پرکھیں، جب کہ فی الاصل یہ کسوٹی تخلیقی عمل کو سمجھنے والی ہے ہی نہیں ۔ دیکھیں، جب آصف فرخی کو ایک انٹرویو میں غلام عباس نے یہ کہا تھا کہ ''افسانہ ادب کی سہل ترین صنف ہے'' تو ساتھ ہی اُنھیں یہ وضاحتی بیان بھی دینا پڑا تھا کہ ''جو چیز دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے، اتنی ہی مشکل بھی ثابت ہوسکتی ہے۔'' منٹو نے اگر یہ کہہ رکھا ہے کہ ''ایک تاثر خواہ وہ کسی کا ہو، اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر وہی اثر کرے، افسانہ ہے'' تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فکشن کی فضا میں نہ رہنے والا آدمی بھی اس طرح کے بیان کو فکشن کا بیانیہ بنانے پر قادر ہوتا ہے۔ دیکھیے محمد حسن عسکری

نے افسانہ لکھنے کو کتنا آسان عمل کہہ رکھا ہے ’’واقعات کا ایک سلسلہ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں‘‘، مگر ذرا عسکری صاحب کے اپنے افسانے اُٹھا کر دیکھئے اور پڑھ کر بتایئے کہ کیا وہ محض واقعات کا ایک سلسلہ ہیں؟ نہیں صاحب! کہانی واقعات کا ایک سلسلہ ہوسکتی ہے مگر افسانہ نہیں۔ کہانی حیاتیاتی انسان سے معاملہ کر کے الگ ہوسکتی ہے مگر افسانہ نفسیاتی انسان سے بھی اُلجھتا ہے اور کہانی پن کے مجرد تصور کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اور یہیں سے ایک عام سا سہل سا عمل بھیدوں بھرا ہو جاتا ہے۔

سوال: نوجوان افسانہ نگاروں کو یہ شکوہ ہے کہ افسانوں کے انتخاب، سالانہ جائزوں اور مقالات میں صرف پرانے اور موجودہ عہد کے چند گنے چنے افسانہ نگاروں ہی کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ کیا یہ شکایت درست ہے؟

محمد حمید شاہد: یہ ایسا سوال نہیں ہے جس پر میں اپنا ردعمل دوں کہ یہ اس کھیل کا لازمی حصہ ہے۔ ہم سے پہلے جو لکھنے والے تھے انہیں بھی عین مین ایسی ہی شکایت رہی۔ ہم نے جب لکھنا آغاز کیا تو ہم بھی شکایتوں کے ڈھیر لگاتے رہے اب نئے لوگوں کو شکایت ہے۔ یہ شکایت اگر درست ہے بھی تو ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ان کی توجہ مسلسل اپنے تخلیقی کام کی طرف رہنی چاہیے انہیں ادبی پرچوں میں چھپنا چاہیے کہ ادبی پرچے تو ہمیشہ اچھی تخلیقات کی تاہنگ میں رہتے ہیں جو تخلیق جاندار ہوگی خود بخود توجہ حاصل کر لے گی۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ادبی میدان میں وقار سے آگے بڑھنے کا یہی قرینہ ہے۔

سوال: آج کل نوجوانوں کا ایک طبقہ مائیکروفکشن کی ترویج واشاعت کی کوشش میں مصروف ہے؛ ردعمل کے طور پر بعض ادیب از راہ تمسخر کہتے ہیں کہ پھر تو ملا دوپیازہ کے لطیفے بھی مائکروفکشن ہیں۔ ایک طبقہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو لوگ جملہ سازی کے فن سے ناآشنا ہیں، یہ ان کا چور راستے سے افسانہ نگار بننے کی کوشش ہے۔ آپ کے راہ نمائی درکار ہے؟

محمد حمید شاہد: نصرت بخاری صاحب! آپ نے راہ نمائی کی بھی خوب کہی، سوال بنانے کا جو قرینہ آپ نے چنا ہے، میں اس سے پہلے اُلجھتا ہوں اور پھر اس سے نکلنے کو عافیت والا راستہ تلاش کرنے لگتا ہوں ۔ ۔ دیکھیے صاحب، اگر یہ چور راستہ ہے، تو اس خاکسار سے کیا راہ نمائی مطلوب ہے؟ صاحب! ہم پہلے سے یہ گماں کر کے کیوں بیٹھ جائیں کہ مائکروفکشن لکھنے والے جملہ سازی کے فن سے نا آشنا ہیں۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں بعضے ٹھیک ٹھاک جملہ ساز بھی ہیں اور جملہ باز بھی۔ کچھ تو ایسے ہیں کہ طبیعت کے رواں ہونے پر طویل بھی لکھ لیتے ہیں مثلاً سولفظوں کی کہانی والے مبشر علی زیدی کے ہاں ایسے طویل افسانے میں دیکھ چکا ہوں، جو اپنی جگہ کامیاب تخلیقات ہیں۔ احمد اعجاز نے افسانے لکھے ہیں اور ہم سب سے داد پائی ہے۔ اقبال خورشید اور کئی دوسرے دوست بہت متوجہ کرنے والے طویل افسانے لکھ چکے ہیں۔ اقبال خورشید نے ایک بہت اہم ناول بھی لکھا ہے مگر یہ تینوں صاحبان لگ بھگ ہر روز ایک مائیکروفکشن لکھتے ہیں کہ تینوں صحافی بھی ہیں اور انھوں نے اپنی منی کہانی کو باقاعدہ ایک کالم کی طرح لائق توجہ بنا لیا ہے۔ ان کالم کہانیوں کو پڑھنے والوں اور پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی خُرد کہانیاں پڑھنے والے فکشن پڑھنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ سچ بھی ہے۔ اگر یہ مان لیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو لکھنا آتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مائکروفکشن لکھنا ان کے لیے چور رستہ نہیں ہے۔ وہ خلوص نیت کے ساتھ اس صنف کو ادبی صنف بنانا چاہتے ہیں جو صحافت کے میدان میں ان کا خوب خوب ساتھ نبھا رہی ہے ۔ لیجئے صاحب، جو میں نے کہا اگر اسے آپ تسلیم کر لیتے ہیں تو آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔ یہی کہ اپنے سوال میں سے سارا تیکھا پن اور طنز کا زہر نکال کر ایک طرف رکھ دینا ہوگا۔ دیکھئے اب سوال کتنا سنجیدہ ہو گیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ اس امر سے آگاہ ہیں کہ مجھے مائکروفکشن کو ماننے میں تامل رہا ہے۔

اب وجہ بھی جان لیجئے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ اس میں تخلیقی عمل کے آزادی سے کام کرنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جی وہی آزادی جس کے بارے میں میلان کنڈیرا نے کہا تھا کہ لکھتے ہوئے، کہانی کے کرداروں کو مکمل آزادی دی جانی چاہیے۔ یاد رہے کہ فکشن کے تخلیقی عمل کے دوران مصنف کی طرف سے کسی قسم کی تحدید تخلیق عمل کے حق میں نہیں جاتی ۔فکشن پارے کی طوالت تو خود تخلیقی عمل نے طے کرنی ہوتی ہے۔اسے، یہاں وہاں سے کاٹ پیٹ کر کیسے مائیکروفکشن بنایا جاسکتا ہے۔ایک اور بات؛ مائکروفکشن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ساری توجہ بات کہنے پر مرتکز رہتی ہے جب کہ فکشن کا بنیادی مقصد بات بیان کرنا نہیں بلکہ ایک صورت حال کے اندر کرداروں کو رکھ کر کچھ سجھانا ہوتا ہے۔ایک صورت حال کے اندر رکھ کر ان کرداروں کی شناخت قائم کرنا ہوتی ہے تا کہ قاری ماحول سے مانوس ہونے کے ساتھ ساتھ اس صورت حال میں پڑے ہوئے کرداروں سے بھی مانوس ہو جائے۔ظاہر ہے ایسے کرداروں کو لکھنے کے لیے متن کے اندر جتنی گنجائشیں درکار ہوتی ہیں اُنہیں کام میں لانے کے لیے، زمان اور مکان سے کچھ معاملہ کرنا پڑے گا۔خُرد کہانی لکھنے والوں نے متن میں یہ گنجائشیں فراہم کرنے کے بجائے بطور راوی خود مداخلت کو شعار کیا ہوا ہے۔وہ مسئلہ اشاروں میں بیان کر کے اسے نثم کا سا بنا لیتے ہیں؛ سمجھ گئے ہیں نا، نثم؟ جی نثر میں شاعری؛ اب یہاں فکشن کا اپنا بیانیہ ہی غائب ہو گیا ہے۔ چلیے مان لیتے ہیں کہ جملوں کی ساخت کو الگ سار کھنے، اُنہیں توڑنے اور رموز واوقاف کے استعمال سے بیانیے میں تاثیر بڑھائی جاسکتی ہے مگر یہاں تو فکشن کا بیانیہ مرتب کرنے کے بجائے شاعری کا التباس پیدا کیا جا رہا ہے۔ایسی متعدد نثموں اور نظموں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جو خرد کہانی کے اسلوب میں ہیں اور زیادہ تخلیقی بھی ہیں مگر ہم ایسی تحریروں کو فکشن نہیں مانتے ۔ پھر کمزور نظموں یا نام نہاد نثموں کو فکشن کیوں مان لیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ایسا متن جس کے اندر مواد

شعری ہو مگر لکھنے کا قرینہ نثر کا ہو، یا ایسا متن جس کے لکھنے کا قرینہ نظم کا ہو مگر مواد غیر تخلیقی نثر کا ہو دونوں فکشن سے باہر کے علاقے ہیں۔ جو بات فکشن کو شاعری سے الگ کرتی ہے وہ ہے زمان اور مکان سے اس کے تعلق کی نوعیت۔ شاعری بس زمان اور مکان کی اتنی پابند ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنے مکاں کے اعتبار سے ایک التباس پیدا کر لے جب کہ فکشن کو اپنا منظر پوری طرح کاغذ پر اُتارنا ہوتا ہے، یوں کہ سب کچھ واضح ہوتا چلا جائے۔ اس سب کے باوجود، جو میں اوپر عرض کر آیا ہوں، بتاتا چلوں کہ کہیں لکھ کر تسلیم کر چکا ہوں کہ مسلسل لکھنے کے عمل میں ایسی تخلیق کا سامنے آ جانا، جسے زمان و مکان نے اپنا معجزہ دکھا کر مکمل فکشن پارہ بنا دیا ہو اور وہ اتنا ہی مختصر ہو، جتنا کہ مائکروفکشن والوں کا مطالبہ ہے، ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ مختصر لکھنا بجائے خود ایک خوبی ہے۔ تاہم یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ اس اختصار کی حدیں تخلیقی عمل کے دوران خود بخود طے ہوتی ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ فن پارے کے اندر سے سب حشو زوائد خارج ہو جائیں اور باقی وہ متن رہ جائے جس کی ایک سطر منہا کریں تو فن پارے کی عمارت منہدم ہونے لگے یا اس میں ایک کمی کا احساس جاگ اُٹھے تو جانیے کہ اس فن پارے کا یہی اختصار ہے۔

سوال: آپ کے مضامین اور انٹرویوز میں مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ آپ اس صلاحیت کو اپنے افسانوں کیوں منتقل نہیں کرتے؟

محمد حمید شاہد: صاحب! میں بہت سنجیدہ بیٹھا کسی ایسے سوال کا منتظر تھا کہ جو تخلیق اور تخلیقی عمل کے باب میں مجھے کسی نئے رُخ سے دیکھنے اور سوچنے کی طرف دھکیل دے مگر آپ نے سوال کیا تو پہلے ہک دَک اِسے دیکھتا رہا، پھر ہنسی نکل گئی؛ صرف ہنسی نہیں، کھسیانی ہنسی۔ وہ جو کرکٹ کی اصطلاح میں ایک گولی کی طرح داغا گیا بال ''بانسر'' ہوتا ہے نا، تو آپ کا سوال بھی بانسر کی طرح آیا ہے۔ پہلے میں خوش ہوا کہ لو بچ گئے، کسی مشکل میں نہیں پھنسے، یوں

جیسے زن کر کے بال اوپر سے گزرا ہو۔مگر صاحب، آپ کے سوال کا جواب دینے لگا ہوں تو ایک عجب طرح کی مشکل میں پھنس گیا ہوں کہ کہوں تو کیا کہوں۔اس سوال میں آپ نے کہا ہے کہ میرے مضامین اور انٹرویوز میں مزاح کی چاشنی ہے اور میں اس مخمصے میں ہوں کہ مزاح تو بذلہ سنجی، فقرہ بازی، لطیفے، ہزل، خاکہ اڑانے، یا تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ ظہور میں آتا ہے۔ جب کہ میں اس طرح کا خالص مزاح لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ یہ الگ بات کہ ہمیشہ میری یہ کوشش رہی ہے۔کوشش نہ کہیں، مزاج کہہ لیں کہ زبان کو بن بن کر اور بنا بنا کر نہ لکھوں۔سنجیدہ بنانے کے لیے، اسے خشک بنا لینا میرا وتیرا نہیں ہے۔ مکالمہ مجھے محبوب ہے اور مکالمہ قدرے شگفتہ اور بے تکلفی والے ماحول میں رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اوپر سے اوڑھی ہوئی فضا میں مکالمہ دیر تک اور دور تک نہیں چلایا جا سکتا۔اگر ایسا کیا جائے تو مکالمے اور گفتگو کا وہی حشر ہوگا جو ناول Don Quixote کے مصنف Miguelde Cervantes سے ایک ایڈمرل کی ملاقات اور گفتگو کا ہوا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس ایڈمرل کی ملاقات ایک موقع پر سروانتیس سے ہوگئی، اُنھوں نے ڈان کیہوٹے پڑھ رکھا تھا اور اس کے شگفتہ بیانیے سے خوب خوب متاثر تھے مگر اب یوں ہو رہا کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے، ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یقیناً ایڈمرل نے اپنے محبوب لکھنے والے سے مکالمے کی کوشش کی ہوگی مگر وہ سنجیدہ تھے سنجیدہ رہے۔ایڈمرل صاحب حد درجہ مایوس ہوئے اور اس کا صاف صاف اظہار بھی کر دیا۔سروانتیس کا جواب بہت مزے کا ہے؛ کہنے لگے ایڈمرل صاحب میں تو آپ سے مایوس نہیں ہوا۔آپ بھی بیٹھے ہیں اور میں بھی بیٹھا ہوں مگر میں نے آپ سے توپ چلانے کے لیے نہیں کہا ہے، جو آپ کا منصب ہے، ظاہر ہے یہ آپ کے کام میں مداخلت ہوگی پھر آپ یہ کیوں آس لگائے بیٹھے ہیں کہ میں یہاں پھلجھڑیاں چھوڑوں گا۔ یہ پھلجھڑیاں والا لفظ مشتاق احمد یوسفی نے سروانتیس اور ایڈمرل

کا واقعہ آصف فرخی کو سناتے ہوئے اس وقت استعمال کیا تھا جب غالباً وہ بھی ان سے مکالمے میں لگ بھگ پھلجھڑیاں چھوٹنے کی توقع باندھے بیٹھے تھے۔ خیر یہاں یہ واقعہ مجھے دو وجوہات سے یاد آیا۔ ایک یہ کہ لیے دیے رہنے سے مکالمہ آگے نہیں بڑھتا۔ رُک جاتا ہے۔ اور بہت جلد ہم ایک دوسرے کو لَکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین کہہ دیتے ہیں؛ تم توپ چلاؤ گے تو ہم پھلجھڑیاں چھوڑیں گے، نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں مکالمہ کرنے والے کے سامنے چپ کر کے بیٹھا نہیں رہ سکتا اور گفتگو کو، گفتگو ہی رہنے دینا چاہتا ہوں، جسے آپ نے مزاح کے طور پر شناخت کیا وہ مزاح نہیں گفتگو کا عام سا قرینہ ہے، جو مجھے عزیز ہو گیا ہے۔ دوسری وجہ اس واقعے کے یاد آنے کی، آپ کے سوال کا دوسرا حصہ ہے جس میں آپ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ میں مزاح والی صلاحیت (اگر یہ واقعی مزاح ہے تو) اپنے افسانوں میں کیوں منتقل نہیں کرتا؟ نہیں جانتا کہ آپ کے من میں کیا آیا ہوگا جب آپ نے سوال کا یہ ٹکڑا سوچا ہوگا مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ فکشن میں اس عنصر کی موجودگی اور اس موجودگی سے پیدا ہونے والی خوبیوں سے خوب آگاہ ہیں۔ کرشن چندر نے ایک دلچسپ بات کہی تھی، یہی کہ انسان اس لیے اشرف المخلوقات ہے کہ یہ ہنستا ہے۔ جبکہ یہودیوں کے ہاں ایک کہاوت مشہور ہے کہ آدمی سوچتا ہے اور خدا قہقہہ زن ہوتا ہے۔ تو یوں ہے کہ فکشن لکھنے والے کا معاملہ اپنی ہنسی کی وجہ سے اس انسان سے ہے جو اپنی زندگی کی اُلجھنوں پر سوچتا ہے۔ سوچتا ہے اور ان الجھنوں سے نکلنے کی راہیں تلاش کرتے ہوئے اور اُلجھ جاتا ہے۔ انسان کی اس بے بسی پر خدا کا قہقہہ لگانا سمجھ میں آتا ہے اور یہیں سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فکشن انسانی صورت حال کی تطہیر کے علاوہ اور کیا ہے؟ سو یہ ایک کلی کی طرح چٹک اُٹھنا، مسکرا دینا اور قہقہہ بار ہونا بھی انسانی صورت حال سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے آنسوؤں کا اندر پڑنا، چپکے چپکے یا پھوٹ پھوٹ کر رونا۔ ایسے میں فکشن کے بیانیے کا شگفتہ

ہونا (اس شگفتہ ہونے میں سلیقہ شرط ہے) کئی مواقع پر متن کی خوبی بن کر آتا ہے۔۔یوسفی صاحب تو صاف صاف کہتے تھے کہ ان کی مزاح نگاری کے مآخذ انگریزی کے مصنفین رہے ہیں جن میں کئی فکشن لکھنے والے تھے۔جین آسٹن کے فرسٹ امپریشن (Frist impression) کے کرداروں کو پڑھتے ہوئے آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ مزاح فکشن کے لیے ممنوعہ علاقہ نہیں ہے۔اردو والوں نے بھی جہاں اس کی ضرورت رہی بخوبی برتا ہے۔اور ہاں یہ میرے ہاں بھی ہے شاید آپ کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ہو سکے تو ''آٹھوں گانٹھ کمیت'' جیسے افسانے دیکھ لیجئے، جو آپ چاہتے ہیں وہ آپ کو وہاں مل جائے گا۔

سوال: ایک تخلیق کار پر گرامر اور املا کی پابندی عائد کرنا یا اُسے کسی املا کا پابند بنانا مناسب ہے؟اس سے تخلیقی عمل متاثر نہیں ہوگا؟ کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ صرف اپنی تخلیق اور موضوع کے بارے میں جواب دہ ہو؟

محمد حمید شاہد: گویا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ مچھلی کو تیرنے سے غرض ہونی چاہیے، چاہے پانی ہو نہ ہو، زبان تو ایک ادیب کے لیے ایسے ہی ہے جیسے مچھلی کے لیے پانی۔مانا کہ جسے ناچنا آتا ہوگا وہ آنگن ٹیڑھا ہونے کی شکایت نہیں کرے گا، مگر جسے ناچنا ہے اسے آنگن کا وہ ٹکڑا تو چاہیے نا، جہاں اس کے قدم اپنی ایڑھیوں پر گھوم اور پنجوں پر تھرک سکیں۔صاحب! وارث علوی نے کہیں لکھا تھا کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک تخلیق کار کا ذہن بچے کی طرح معصوم ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تخلیق کی جادونگری میں بچگانہ ذہن سے داخل ہو۔ یہ ژونگ کا قول ہے کہ لکھنے والے کے ذہن کو تعصّبات سے پاک ہونا چاہیے یوں کہ وہ حیرت سے چیزوں کو دیکھنے کے قابل ہو سکے۔اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک تخلیق کار کو صرف اپنی تخلیق اور محرک تخلیق سے وابستہ رہنا چاہیے؛ ایک پاکیزہ، معصوم دِل اور سادہ

ذہن کے ساتھ، جیسا کہ ایک بچے کا ہوسکتا ہے تو اس سے یہ کیسے اخذ کرلیا جاتا ہے کہ اس کی زبان بھی بچگانہ ہو تو کام چل جائے گا۔ نہیں صاحب نہیں، اس باب میں کوئی رعایت نہیں ہے۔ قلم اُٹھانے سے پہلے محبت سے اور محنت سے زبان سیکھنا پڑے گی۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ ''اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا دراصل ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس زبان نہیں، وہ لفظوں کے مختلف قبیلوں سے آگاہ نہیں، وہ نہیں جانتا کہ کہاں کون سا لفظ آئے گا تو معنی اور جمال کے دھارے کیسے پھوٹ بہیں گے؟ اور یہ کہ جملے کی ساخت کیا ہو، لہجہ کیسے بنے گا اور کون سا لہجہ یہاں بننا چاہیے تو لکھنے والا تخلیقی عمل سے ڈھنگ سے کیسے وابستہ ہو پائے گا؟ یہ جسے فیض صاحب نے طرزِ ادا کہا ہے، وہ فکشن میں بیانیہ ہو جاتا ہے۔ کہانی یعنی Fabula، اور جس طرح اس کہانی کا متن متشکل ہوتا ہے یعنی Suzet، کہہ لیں پلاٹ کے اندر کہانی کے متن کی تشکیل، کیا ان سب کو زبان سے باہر دیکھا جا سکتا ہے۔ نہیں نا! تو پھر یہ کیسے ممکن ہو پائے گا کہ تخلیقی عمل کو ایک ٹھٹکی سہمی یا اُکھڑی ہوئی زبان آزادی سے اپنا کام کرنے دے گی اور خود بخود بیانیہ متشکل ہو جائے گا۔

سوال: بالعموم کہا جاتا ہے کہ ایک شاعر پوری غزل سے ایک دو شعر منتخب کر کے محفل لوٹ لیتا ہے؛ جب کہ افسانہ نگار ابھی تک اس ہنر کو نہ پا سکا۔ اگر جملے چست اور نپے تلے ہوں تو انھیں شعر کی طرح کہیں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے؛ کیا جملہ شعر کے اس مقام تک پہنچ سکتا ہے؟

محمد حمید شاہد: محفل لوٹنے کی بھی آپ نے خوب کہی گویا آپ یگانہ کی زبان میں یوں کہنا چاہتے ہیں:

اک وہ کہ پھرا کرتے ہیں اکڑے اکڑے
اِک ہم کہ شکنجے میں پڑے ہیں جکڑے

صاحب، معاف کیجیے مجھے یوں لگتا ہے کہ ایسا سوچنے والے، فکشن کے اپنے بھیدوں سے آگاہ

نہیں ہیں جب ہی تو وہ اس صنف کے اندر تاثیر کہاں سے آتی ہے؟ اس کی جمالیات اور معنویت کا جادو کیسے بولتا ہے؟ اس پر نگاہ کئے بغیر اُس ''واہ واہ'' کے پیچھے ہو لیے ہیں جو لمحاتی ہے اور کہیں تو محض مجلسی ہے۔ اس سے زیادہ ''وہ واہ'' ایک لطیفہ، ایک چٹکلا، ایک دانش پارہ یا ایک کہاوت بھی سمیٹ سکتی ہے تو کیا عوامی سطح کی لمحاتی مقبولت کے لیے افسانے کو اپنے تخلیقی وقار سے اس کم تر سطح پر گر جانے دیا جائے؟ افسانے کے جملے کو شعر کے مقام تک پہنچانا اس کے لیے قطعاً عظمت نہیں ہے کہ زبان کے حوالے سے افسانے کو فکشن کا بیانیہ ہی عظیم بنا سکتا ہے اور بس۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ہاں شاعری کی اپنی ایک مستحکم روایت ہے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ قصے اور داستان کی ہیئت میں بھی اس شعری روایت نے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اس باب میں اُردو کے ابتدائی منظوم قصوں کو کون بھول سکتا ہے۔ یہ قصے ہندی، عربی اور فارسی کے تھے اور ہمارے ہاں بات کہنے کا ایک مزاج بنا رہے تھے۔ طوطی نامہ کی کہانیاں ہوں یا ہشت اشت کے قصے یا پھر ملک محمد جائیس کی پدماوت میں غلام علی کے اضافے۔ اسی طرح حاتم طائی، چہار درویش، لیلیٰ مجنوں، کلیلہ و دَمنہ سے کسی نہ کسی صورت کہانیاں نکل کر بعد میں افسانہ نگاری کی فضا ضرور بنائی تھی اور ان کے زیر اثر جب لکھا جاتا تھا تو ''محفل لوٹ لینے'' والی آپ کی حسرت بھی پوری ہو جایا کرتی تھی۔ ملاوجہی کا نثری قصہ سب رَس ہو یا میر تقی میر کی مثنوی شعلہ عشق، جسے مرزا رفع سودا نے نثر میں ڈھالا تھا، ہمارا سرمایہ ہیں مگر اس حقیقت کو بھی ماننا ہو گا کہ ہمارے اَفسانے کی عمارت مغرب کے فکشن کے اصولوں پر کھڑی ہے۔ اس سلسلے کا بنیادی اصول یہی ہے کہ فکشن کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہو گی فکشن کی اپنی زبان ہو گی۔ تاہم یہ بھی لازم ہے کہ تخلیقی عمل میں اپنی تہذیب اور ثقافت کی روح کو فکشن کا بیانیہ بنانا بنانا ہو گا اور سچ یہ ہے کہ عین آغاز سے اردو افسانے نے یہی چلن شعار کیے رکھا ہے۔ اُردو اَفسانے کو جس طرح کی چست قبا چاہیے تھی وہ داستان کے پاس تھی نہ یہ قصے کوئی

صورت سجھا پائے تھے اور نہ ہی ہماری عظیم شعری روایت اس باب میں کوئی مدد کر سکتی تھی کہ اس کا اپنا علاقہ تھا اور اس میں اس نے خوب خوب جوہر دکھائے تھے۔ہاں ماننا ہوگا کہ اس باب میں ایک عظیم شاعر اپنی نثر کے ذریعے ہماری مدد کو آیا تھا۔جی، میری مراد اسداللہ خان غالب سے ہے۔اور غالب نے یہ کام اپنے خطوط کے ذریعے کیا تھا۔اس بے مثل اور بے مثال شاعر نے نثر کی زبان چُست کر کے فکشن کی زبان سجھا دِی تھی۔یہیں ایک واقعہ سن لیجئے۔ایک بار میرزا رجب علی سرور لکھنوی، لکھنو سے غالب کو ملنے کی خاطر آئے اور باتوں ہی باتوں میں اُن سے پوچھنے لگے کہ مرزا صاحب کہیے، کس کتاب میں اُردو زبان کو بہت عمدگی سے برتا گیا ہے؟ گویا سرور صاحب وہی آپ کے سوال والی بات پوچھ رہے تھے۔تب تک غالب نہیں جانتے تھے، کہ سوال کرنے والے صاحب ہی صاحبِ فسانہ عجائب ہیں لہٰذا جھٹ میر امن دہلوی کی کتاب ''قصہ چہار درویش'' کا نام لے لیا کہ اسی کتاب کی نثر اُنہیں پسند تھی۔سرور صاحب بے چین، کہ انہیں تو غالب کی رائے اپنی کتاب ''فسانہ عجائب'' پر چاہیے تھی اور وہ ادھر آئے ہی نہ تھے۔چنانچہ سیدھا اپنی کتاب کا نام لے کر سوال داغ دیا کہ فسانہ عجائب کی زبان کیسی ہے؟، غالب کو''قصہ چہار درویش'' کے مقابلے میں ''فسانہ عجائب'' کا نام لینا برہم کر گیا۔ٹُرت کہہ دِیا:''اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطفِ زُبان کہاں،ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔''اب اگر آپ کی نظر میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش ہے اور میرزا رجب علی سرور کی فسانہ عجائب بھی، تو آپ کو غالب کا اصرار کے ساتھ اس کی نثر کو اچھا کہنا اور بہت عمدہ نثر ہونے کے باوجود سرور صاحب کا غالب سے اس کی تعرلف نہ سن کر تلملانا اور بے مزہ ہونا سمجھ میں آ گیا ہوگا۔صاحب اس واقعے میں ہمارے سمجھنے کو کئی باتیں ہیں۔ان باتوں میں ایک بات کا تعلق آپ کے سوال سے جڑ جاتا ہے۔وہ یوں کہ اگرچہ سرور صاحب کے جاتے ہی احباب کے بتانے پر کہ ناراض ہونے والے صاحبِ فسانہ عجائب تھے، غالب

خود سرور کو منانے پہنچ گئے اور ''فسانہ عجائب'' کی نثر کی خوبی اور رنگینی کے علاوہ فصاحب و بلاغت کا ذکر کر کے اُنہیں منا لیا تھا مگر یہ بات بھی سجھا دی تھی کہ تخلیق اپنے مزاج کے اعتبار سے اپنی زبان کا انتخاب کرتی ہے اور اس باب میں میر امن دہلوی کے ہاں یہ کام سلیقے سے ہوا تھا۔ اب اگر میں اپنی بات ڈھنگ سے کہہ پایا ہوں تو اسے ایک جملے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ افسانے کو داد سمیٹنے کا ہوکا نہیں ہونا چاہیے کہ اسے خود اپنے اندر کے بھید بھنور سنبھالنے ہوتے ہیں۔ فکشن کے بھید بھنور ہی اس کی اپنی روح ہیں جو اسے محض لمحاتی واہ واہ بٹورنے کی بجائے جمالیاتی اور معنیاتی قدروں کی مستقل بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

سوال: میرا ذاتی خیال ہے کہ شعر پر تنقید کرنے والا شاعر ہونا چاہیے ورنہ وہ اس ماحول اور مزاج کو نہیں سمجھ پائے گا، جس نے شعر تخلیق کرنے کی تحریک پیدا کی؛ افسانے کے ناقد کا افسانہ نگار ہونا لازم ہے؟

محمد حمید شاہد: گویا آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ایک ڈاکٹر کو کسی ایسے مریض کا علاج نہیں کرنا چاہیے جس کا مرض اس نے خود نہ بھگتا ہو۔ یہ کیا بات ہوئی صاحب؟ کیا ایسی ہی پابندی آپ ایک تخلیق کار پر بھی لگانا پسند فرمائیں گے؟۔ منٹو کو چوان نہیں تھا، اس نے ''نیا قانون'' میں منگو کو کیسے لکھ دیا۔ بیدی کو ''لاجونتی'' کی لاجو کا تجربہ کیسے ہوسکتا ہے وہ تو ایک مرد تھا، اور اس کا اغوا بھی نہیں ہوا تھا۔ انتظار حسین نے ''زرد کتا'' میں لومڑی جیسی ایک چیز کا ذکر کیوں کر دیا جو منہ سے نکلتی تھی اور جسے پاؤں تلے جتنا کچلا جاتا وہ بڑی ہو جاتی تھی کہ ایسا تجربہ تو ممکن ہی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ جو اصول آپ وضع فرما رہے ہیں یہ چلنے بکنے والے نہیں ہیں۔ دیکھیں، جس طرح ڈاکٹر اور مریض دو الگ وجود ہیں اور اُن کا تجربہ بھی اپنا اپنا ہے، حالاں کہ دونوں ایک ہی مرض سے معاملہ کر رہے ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح تخلیق کار اور فن پارے کو اپنے تئیں تعبیر دینے والا یا اس کی تعیین قدر کرنے والا نقاد دونوں کا وظیفہ الگ ہو جاتا ہے۔ دونوں کی اپنی

اپنی qualifications اور اپنے اپنے لوازمات ہیں۔ ایک ناقد قدم قدم چلتا ہے، مگر ایک تخلیق کار کے لیے یہ لازم نہیں ہے کیوں کہ اس کی تمنا کا دوسرا قدم کہیں بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کی صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپکتے رہتے ہیں۔ ایک ناقد ان قطروں کو گنتا ہے اور عقب میں جا کر علت اور معلول کا رشتہ قائم کرتے ہوئے نئی معنویت قائم کرتا ہے۔ ایک اور بات ؛جس طرح ایک عروضی کی بابت یہ فیصلہ نہیں دیا جاسکتا کہ وہ لازماً اچھا شاعر بھی ہوگا، اسی طرح ایک اچھے شاعر کی بابت یہ گمان باندھ لینا کہ وہ اپنے اشعار کی جامع تعبیر بھی کر پائے گا ایک غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مستثنیات کی بات الگ ہے مگر اسے کلیہ نہیں بنایا جاسکتا کہ شعر پر بات کرنے والے کو شاعر بھی ہونا چاہیے۔ یہی بات میں افسانہ نگاری اور افسانے کی تنقید کے حوالے سے بھی کہوں گا۔ فکشن لکھنے والا ایک زندگی نہیں جیتا وہ ایک جسم میں کئی زندگیاں جی رہا ہوتا ہے۔ وہ جو منشا یاد کہتے تھے کہ لکھتے ہوئے وہ اپنے کرداروں کی کھال میں بیٹھ جایا کرتے تھے، تو بات اس سے بھی آگے بڑھ جایا کرتی ہے۔ لکھنے والا محض کرداروں کی کھال نہیں اوڑھتا ، اپنے وجود کو معطل کر کے اپنے کردار کے وجود کو اس کی روح سمیت اپنی کھال کے اندر کھینچ لایا کرتا ہے۔ اسے وہیں بسا لیتا ہے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ متن احساس کی سطح پر تعمیر ہونے لگتا ہے۔ احساس کی یہ اتھل پتھل زمان و مکان میں اکھاڑ پچھاڑ پیدا کر دیتی ہے، یوں جیسے ایک غوطہ خور شفاف پانی کی ہموار سطح کو پھاڑتا، اس میں اتھل پتھل پیدا کرتا ہے تو پانی کے اندر اس کی چشم پر زمین و آسمان کا نظارہ بھی اشرفیوں کی طرح کھنکتی اچھلتی پانی کی بوندوں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ دیکھیے آپ ایک پینسل کو بھرے ہوئے گلاس میں ڈبو کر نظارہ کر سکتے ہیں کہ وہ ٹیڑھی ہے حالاں کہ وہ ٹیڑھی نہیں ہوتی یہ پانی ہی ہے جو اس کے وجود میں رکھنے کا ایک بھید بھر دیتا ہے۔ ایک تخلیق کار کا تجربہ محض نظارہ کرنے والے یا اس کی سائنسی توجیح کرنے والے کا نہیں ہوتا، وہ زندگی کو حسی سطح پر جھیل کر ایک متن میں مرتب کرتا ہے، جی ایک متن میں، جس کی اپنی

جمالیات بھی مرتب ہو رہی ہوتی ہے۔اس میں پانی کی بوندیں اشرفی کی طرح کھنک کر موجود منظر میں حک و اضافہ کر کے ایک نئے منظر میں ڈھال سکتی ہیں۔ایک سیدھے وجود میں رخنہ دکھا سکتی ہیں۔اور ہاں یہ جو پانی کی بوند کے اشرفی بن جانے والا خیال ہے، یہ مجھے یوں ہی نہیں آ گیا شاید میرے دھیان میں فیض کی وہ نظم تھی کہ جو انہوں نے ایرانی طلبا کے نام لکھی تھی ''یہ کون سخی ہیں/ جن کے لہو کی/ اشرفیاں چھن چھن چھن چھن/ دھرتی کے پیہم پیاسے/ کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں/ کشکول کو بھرتی جاتی ہیں/۔۔۔'' تو، آپ کا مجوزہ اصول لے کر چلیں تو فیض کا تجربہ لائق اعتنا نہیں رہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ لہو کے قطرے چھن چھن کرتی اشرفی کی صورت دیکھی جا سکیں مگر تخلیق کار یہ دیکھتا ہے اور دِکھا سکتا ہے۔

اچھا یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ تخلیق کا محرک بہت معمولی اور عام سا واقعہ، خیال یا احساس ہو سکتا ہے مگر تخلیقی عمل اس کی کیمسٹری بدل دیا کرتا ہے۔اس لیے کہ تخلیق نہ تو محض وقوعہ یا موضوع رہتی ہے نہ محض انشا پردازی۔موضوع، مواد اور زبان یہ سب ایک خالص تخلیقی لمحے میں بہم ہو کر ہی فن پارہ بنتے ہیں اور جس تناسب اور ترکیب میں بہم ہوتے ہیں، انہیں غیر تخلیقی لمحوں میں پھر سے بہم نہیں کیا جا سکتا۔اگر آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک تخلیق کار اپنے فن پارے کی درست درست اور کلی تفہیم سے قاصر رہتا ہے اور اکثر تخلیق کے محرک سے ایک تعلق کے سبب اس کی تعبیر بھی محدود ہو جاتی ہے۔ایک ناقد کو بہ ہر حال ایک آزادی ہوتی ہے کہ وہ فن پارے کو فاصلے سے دیکھے۔حسن اور بھید ہمیشہ فاصلے کے سبب قائم رہتے ہیں۔اور ناقدین، فن پاروں سے کسی جذباتی وابستگی کے بغیر بہتر تفہیم کر لیا کرتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ماننا ہوگا کہ ایک ناقد ایک فن پارے کی ایک حد تک ہی تحسین کر سکتا ہے ایک عمدہ تخلیق میں ہر تعبیر کے بعد کچھ نہ کچھ پہلو رہ جاتے ہیں جو کسی اور ناقد پر ظاہر ہونا ہوتے ہیں یا کسی اور زمانے میں کھلنا ہوتے ہیں ۔میری اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ناقد تخلیق کار نہیں ہو سکتا یا ایک تخلیق کار کو تنقید کرنے

سے باز رہنا چاہیے۔ایک تخلیق کار جب اپنے تخلیقی عمل کا آغاز ہوتے ہی ایک ہیئت کا انتخاب کر رہا ہوتا ہے یا متن کی حسی تشکیل کرتے ہوئے ایک جمالیات مرتب کرر ہا ہوتا ہے تو ایک ناقد بھی اس کے اندر چوکس اپنا فریضہ سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔یہ ناقد بڑ بولا نہیں ہوتا، اعلان کر کے فکر، مواد، یا ذخیرہ الفاظ پر نہیں جھپٹتا، چپکے چپکے اپنا کام کرتا اور متن میں تخلیقی بھید بھر دیتا ہے۔فن پارے کی تکمیل کے بعد جس ناقد سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے وہ اپنے تنقیدی قرینوں کا اعلان کر کے متن کی طرف بڑھتا ہے اور یہیں سے دونوں الگ ہوجاتے ہیں۔

سوال: افسانے یا کہانی میں فلسفہ یا کسی نظریہ کی تبلیغ کس حد تک جائز ہے؟ کیا اس زمانے میں افسانے کی ذریعے نظریے کی تبلیغ ممکن ہے؟

محمد حمید شاہد: اگر صاف لفظوں میں پوچھیں گے، تو مجھے کہنا ہوگا: ''نہیں، بالکل نہیں''۔مگر یوں صاف صاف نفی میں جواب اس مسئلے کو اور الجھا دے گا۔دیکھیے ایک مچھلی پر آپ کیسے قدغن لگا سکتے ہیں کہ وہ پانی میں تیرتی رہے مگر گیلی نہ ہو۔فکریات میں رچے بسے آدمی کی تخلیقات سے اس کی فکریات کا چھلک پڑنا خلاف واقعہ نہیں ہے۔تاہم میرا اس بات پر ایمان ہے کہ ادب کی روایت انسان دوستی کی روایت ہے۔اس کا مطالعہ کسی بھی فلسفے کی روشنی میں یا کسی نظریے اور فکر کے حوالے سے کیا تو جا سکتا ہے مگر تخلیقی عمل میں فکریات کا شعوری التزام فن پارے کو ناقص، اُتھلا اور محدود بنا دِیتا ہے۔جب میں انسان دوستی کی بات کرتا ہوں تو کسی خاص فکر کے زیر اثر ایسا نہیں کرتا، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ متنوع اور متصادم نظریات کا وہ عطر ہے جس کی مہک سب کو خوش آتی ہے، سب کے ہاں قابل قبول ہو جاتی ہے۔آپ جانتے ہی ہیں کہ جب ہم نظریات کی زمین پر قدم رکھتے ہیں تو ساتھ ہی اس یقین کی زمین پر بھی قدم رکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم ہی درست ہیں۔نظریات ہمیشہ تضاد کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔دوسروں کی فکریات کی نفی کے بغیر آپ کا اپنا دعویٰ مکمل نہیں ہو پاتا۔اگر آپ تجزیہ کرنے بیٹھیں تو آپ اس

نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ لگ بھگ سب نظریات انسان اور انسانیت کی فلاح اور سلامتی کو یقینی بنانے کے دعوے پر بنیاد کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے سب کی منزل ایک ہے مگر ہر ایک کا راستہ جدا ہے۔ کہہ لیجئے کہ نظریات اور فکریات سے وابستگی منزل سے وابستگی نہیں بلکہ ان راستوں سے وابستگی ہے جو فکریات نے اپنے تئیں بنائے ہوتے ہیں۔ آپ پنجاب کے ایک پس ماندہ ضلع اٹک میں رہتے ہیں، وہاں بسوں کے اڈے پر آپ نے یہ نظارہ بھی کیا ہوگا کہ جب ایک ہی منزل پر جانے والے مختلف مالکوں کی بسیں چلنے کو تیار ہوتی ہیں تو ان کے کنڈیکٹر ہر اس شخص کو لپک کر اپنی بس کی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں جس پر انہیں مسافر ہونے کا شک گزرتا ہے۔ نظریات اور فکریات کی کھینچا تانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ بس سٹاپ والی کھنچا تانی میں، ہم نے مسافروں کے کپڑے پھٹتے دیکھے ہیں جب کہ نظریاتی اور فکری کھینچا تانی میں خود انسان کے چیتھڑے اُڑ جاتے ہیں۔ گذشتہ صدی میں انسان اور انسانیت کے چیتھڑے اڑنے کا نظارہ سب نے دیکھا ہے، یہی دہشت گردی ہے۔ تہذیبی اکھاڑ پچھاڑ کو ہم نے دیکھا، لسانی سطح پر بگاڑ کا مشاہدہ ہم کرتے رہے، سیاسی عدم استحکام سے لے کر جذباتی انتشار تک کیسے کیسے دہشت کے منظر ہیں جو گزری صدی کی کوکھ سے نکل کر رواں صدی کے کندھوں کا بوجھ ہو گئے ہیں۔ غالباً گلزار کا ایک افسانہ تھا جس میں ایک ویران سے پل پر دو ایسے اشخاص آمنے سامنے آجاتے ہیں جو ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں۔ مجھے افسانے کا نام یاد نہیں، بس اتنا یاد رہ گیا ہے کہ یہ ہندو مسلم فسادات کی دہشت بھری فضا کے بارے میں تھا جس میں سے ایک دوسرے کو اللہ اکبر کہہ کر پل سے نیچے اُچھال دیتا ہے، اس خوف سے کہ کہیں مقابل اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ دوسرا کلمہ پڑھ کر موت کے منہ میں جا رہا ہوتا ہے اور اسی سے خوف کی وہ فضا بنتی ہے جس میں ہر دوسرا شخص دشمن نظر آنے لگتا ہے۔ فکریات کا یہی شاخسانہ ہے کہ خودکش حملہ آور بھی جنت اور حوروں سے ملن کا گماں باندھے ہوئے ہیں اور اسی فکر کے تحت ہم حملہ آور کا

نشانہ بننے والوں کو شہید کہہ کر انہیں جنت کا ایسا مکین قرار دیا جا رہا ہوتا ہے جن کا استقبال حوروں نے کرنا ہوتا ہے۔ نظریات اپنی جگہ بہت اعلیٰ ہو سکتے ہیں، ہوتے بھی ہیں مگر ان سے منسلک افراد اور سماج عملی سطح پر ایسے تضادات کا شکار ہو جاتا ہے کہ ان فکریات کی راہ کھوٹی ہو جاتی ہے ۔مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص تمھیں ایک تھپڑ مارے تو اس کو تھپڑ مارنے کی بہ جائے اپنا دوسرا گال آگے کر دو۔ تو کیا ایسا ہی ہو رہا ہے؟ نہیں نا۔ تو یوں ہے کہ فکریات میں اس تشدد کو جائز قرار دینے کے لیے، اپنی فکر سے وابستہ تاویلات کے ڈھیر لگا لیے جاتے ہیں اور یوں وہ نظریہ خالص سطح پر وہ نہیں رہتا جس کی تبلیغ ادب کے وسیلے سے آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ان تاویلات سے جڑنا دراصل فکری پروپیگنڈا ہے جس کی ادب میں گنجائش نہیں ہوتی اور افسانے میں تو بالکل نہیں۔ ادب تو نظریات کے اس ملبے تلے دبے انسان کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہے مگر ایسا وہ کسی ردعمل میں نہیں کرتا اپنے قرینے سے کرتا ہے۔ جی، ادب دھیمے پن کو شعار کرتا ہے۔ صورت حال کو سہار کر اس کا مشاہدہ کرتا ہے اسے انسانی حسیات سے معاملہ کرنے دیتا ہے اور لکھتے ہوئے اس انسان دوستی کے عطر سے اپنے متن کو معطر کر لیتا ہے جو سب کے ہاں قابل قبول ہے۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان دوستی کا تصور مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مذہبی بھی، یہ سماجی اور ثقافتی ہو سکتا ہے اور سیاسی بھی مگر ادب میں انسان دوستی کا تصور ان سب سے مقطر ہو کر بھی ان کے تابع نہیں ہوتا۔

سوال: افسانہ یا کہانی کی عظمت قاری کی محتاج ہے؟ کیا افسانہ نگار کو قاری کی ذہنی سطح کے مطابق اسلوب نہیں اپنانا چاہیے؟ آج بھی درجنوں ڈائجسٹ فروخت ہو رہے ہیں اور ان میں لکھی جانے والی کہانیاں مقبول بھی ہیں۔ ادبی رسائل کیوں فروخت نہیں ہوتے؟ میں نے مختلف خریداروں سے جب اس حوالے سے بات کی ان کا کہنا تھا کہ ادبی رسائل میں شایع ہونے والی کہانیوں کی زبان بہت مشکل ہوتی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

محمد حمید شاہد: سوال یہ ہے کہ، ایک شخص جس ذہنی سطح پر موجود رہ کر ہی تخلیق کار بن پاتا ہے، اسے، اس ذہنی سطح سے معزول کر کے قاری کی سطح پر لا پٹخنے سے کیا وہ تخلیق کار رہ پائے گا؟ قاری محترم ہے، بہت محترم۔ مگر یہ لکھنے والے کا منصب نہیں ہے کہ وہ اس کے احترام میں کہیں نیچے گر پڑے، اسے قاری کو اوپر اُٹھانا ہوتا ہے، وہاں جہاں وہ خود ہوتا ہے۔ عام قاری سماجی اقدار کا اسیر ہوتا ہے اور ان تحریروں کو پسند کرتا ہے جو اس کی محبوب اقدار پر ضرب نہیں لگاتی جبکہ ادیب اسٹیٹس کو، کو توڑتا ہے اور اس کے لیے ایسا اسلوب وضع کرتا ہے کہ قاری مشتعل ہونے کی بہ جائے حیرت سے صورت حال کو دیکھے اور اس میں سے خود معنی برآمد کرنے کے جتن کرے۔ یہ اسلوب ایک زود ہضم خوراک کی طرح نہیں ہوتا جو ادھر حلقوم سے اترتی ہے اور جزو بدن ہوئے بغیر آنتوں میں سے دَگڑ دَگڑ باہر کا رَستہ لے لیتی ہے۔ یاد رکھیے، وہ ساری تحریریں جن کے معنی کی ترسیل فوراً ہو جاتی ہے جلد حافظے سے بھی نکل جاتی ہیں بالکل اخبار کی اُن خبروں کی طرح جو روز پڑھتے ہیں اور اگلے روز بھول جاتے ہیں۔ لہٰذا افسانے کی عظمت اس سے متعین نہیں ہو سکتی کہ اس کی ترسیل ہو گئی ہے یا وہ مقبول ہو گیا ہے تاہم اس امکان کو بھی قطعاً رد نہیں کیا جا سکتا کہ مقبول ہونے والی کہانی عظیم بھی ہو۔

کسی ڈائجسٹ کے مقبول ہونے اور ایک ادبی جریدے کے مقبول نہ ہونے کا تعلق مواد سے کہیں زیادہ، مواد کی پیشکش اور مارکیٹ تک رسائی سے ہے۔ مثلاً شکیل عادل زادہ کا سب رنگ بہت عمدہ ادبی مواد پر مشتمل ہوا کرتا تھا، لگ بھگ ویسا مواد آپ ایک ادبی جریدے میں چھاپ کر اسے اس مقبولیت سے ہمکنار نہیں کر سکتے تھے جو سب رنگ کا حصہ ہوتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے آغاز میں شکیل عادل زادہ نے یہ ڈائجسٹ نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اشاعت ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔ اچھا مزے کی بات سنیں ایک گفتگو میں شکیل عادل زادہ نے کہا تھا کہ انہوں نے جن لکھنے والوں کو چھاپا وہ مسلمہ ادیب تھے، ایڈ یگر ایلن پو اور موپساں

وغیرہ اور کئی افسانے تو وہ نقوش اور فنون وغیرہ سے منتخب کر کے سب رنگ کا حصہ بنا لیتے تھے ۔ گویا وہی بات ؛ مواد یا میٹر نہیں پیشکش یا پریذنٹیشن ۔ اور اس باب میں ایک لکھنے والے کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا سرورق بنانے والے کا ، ہر کہانی سے پہلے ایک اسکیچ ہوتا اور ہر صفحہ بصری طور پر بھی توجہ کھینچتا تھا۔ پھر یوں بھی تھا کہ وہ عام قاری کی دسترس میں تھا جہاں اخبار بکتا وہیں یہ ساتھ موجود ہوتا ؛ ایسا سب کچھ ادبی جریدوں کے بس میں نہ تھا اور نہ ہی ایسی کوئی روایت بن پائی ہے ۔ کہنے کو تو یہ رسالے ادب چھاپتے تھے مگر جس طرح پروف پڑھنے اور متن کو غلطیوں سے پاک کرنے کے لیے محنت ڈائجسٹ والے کرتے تھے ، ویسی ادھر نظر نہ آتی تھے ۔ کچھ ڈائجسٹ ایک خاص طبقے میں مقبول مواد اور اس طبقے کی نفسیات کے مطابق مواد کو ترجیح دے کر اپنے قارئین کا حلقہ بنا لیتے ہیں ، جیسے اردو ڈائجسٹ یا خواتین ڈائجسٹ ۔ ادبی جرائد عام قاری کی بہ جائے چھاپے ہی ادیبوں کے لیے جاتے ہیں اور انہی میں تقسیم ہوتے ہیں ۔ جو لکھتے نہیں اور محض ادب پڑھتے ہیں وہ بہت کم لوگ ہیں جنہیں آپ ادب کے خالص قاری کہہ سکتے ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہ جرائد ایسے قارئین تک رسائی کر پاتے ہیں اور بس ۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ایسے میں ادبی رسالوں کی مقبولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہ گئی یہ بات کہ افسانے کی زبان آسان ہو، تو پوچھنا چاہوں گا کتنی آسان؟ جس طرح سر بلند ہونے کی کوئی حد نہیں ہوتی ، اسی طرح گرتے چلے جانے کی بھی کوئی حد نہیں ہے ۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ ادیب کو اپنے قاری پر اس تخلیقی رفعت کا بھید کھولنا ہوتا ہے جو وقت کے ایک مخصوص پارچے میں اس پر مہربان رہی ، اسی سے دست کش ہو کر اور اپنے منصب سے گر کر وہ تخلیق کار بھی نہیں رہے گا ۔ یاد رکھیے ہر عمدہ فن پارہ اپنی زبان ساتھ لے کر آتا ہے یہاں سوال افسانے کی مشکل یا آسان زبان کا نہیں ہے، اس مواد کو تخلیقی سطح پر سہارنے اور جمالیاتی سطح پر نکھارنے کا ہے اگر ایسا ہو جاتا ہے تو مشکل زبان بھی

آسان ہو جاتی ہے ورنہ سب ایک گورکھ دھندے اور سعی لا حاصل کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

سوال: آپ اس سے یقیناً واقف ہوں گے کہ جامعات میں بیٹھے محقق حضرات شعر اور افسانہ لکھنے کو فضول خیال کرتے ہیں اور جب کسی طالب علم کو کسی شاعر یا افسانہ نگار کے فن یا شخصیت پر مقالہ لکھنے کی اجازت دیتے ہیں تو ان کا رویہ تضحیک آمیز ہوتا ہے۔

محمد حمید شاہد: ایک حد تک ان کا یہ رویہ سمجھ میں آتا ہے۔ ایک حلوہ قسم کا موضوع تو یہی ہے ''شخصیت اور فن''۔ ہمارے ہاں جب دو چار کمروں کی یونیورسٹیاں کھمبیوں کی طرح اُگ آئیں اور وہاں ایم اے اردو یا ایم فل اردو کے طلبا اور طالبات بھی دستیاب ہو گئے تو موضوعات کی ڈھنڈیا پڑی۔ شخصیت و فن میں یوں سہولت ہے کہ کچھ ادیب سے پوچھ پاچھ کر لکھ لیا جاتا ہے، باقی حصے میں افسانہ نگاری کی تاریخ ادھر ادھر سے کٹ پیسٹ کر لی جاتی ہے۔ ایک باب میں جس پر کام کیا جا رہا ہے اس کے کام کا تعارف سما جاتا ہے۔ پھر یہاں وہاں سے مضامین لے کر فن کا ذکر ہو گیا اس کی بابت کچھ معاصرین نے کہا ہو گا اسے ایک باب میں جمع کر لیا اور اس سب سے تھوڑا تھوڑا لے کر استخراج کا باب مکمل کرتے ہی تحقیقی مقالہ بھی مکمل کر لیا جاتا ہے۔ مانتا ہوں کہ محنت کرنے والوں نے اس میں بھی بہتری کی صورتیں نکالی ہیں مگر بالعموم ''ڈنگ ٹپاؤ'' قسم کا کام سامنے آنے لگا تو ہر جانب سے تنقید ہوئی اور بجا ہوئی۔ مرے کو مارے شاہ مدار، اس پر برا یہ ہوا کہ یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھی تو تعداد میں طلبا و طالبات بھی بڑھ گئے۔ ادھر اساتذہ کو ترقی کے لیے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری چاہیے تھی، ڈگری کے لیے ایک عدد تحقیقی مقالہ لکھنے کا وقت آتا تو موضوع مسئلہ بن کر سامنے آ جاتا۔ سوچنے والوں کے لیے تو موضوعات بہت ہیں مگر یہاں تحقیق سے کہیں زیادہ اہم ڈگری تھی، کسی بھی صورت میں ڈگری، تو ایسے ویسے موضوعات پر اور ایسے ویسے لکھنے والوں کے ایسے ویسے کام پر جس کی کوئی ادبی قدر نہ تھی مقالات لکھے جانے لگے؛ اب

اگر کوئی اس کا ٹھٹھہ اڑائے گا تو کیا حق بہ جانب نہ ہوگا؟ پھر میں نے تو کئی ایسے ''ڈاکٹر'' حضرات بھی دیکھے ہیں جو ڈھنگ سے اُس موضوع پر بات بھی نہیں کر پاتے جس پر اُنہوں نے پی ایچ ڈی کا بھاری بھرکم مقالہ لکھ رکھا ہوتا ہے۔ ایسا مقالہ جسے کتابی صورت میں چھپوانے کا اُن میں حوصلہ نہیں ہوتا مگر ڈاکٹر ہونے کے طفیل وہ استاد ہو کر اپنے شاگردوں کو ''محقق'' بنا رہے ہوتے ہیں، ہے نا عجیب بات! خیر، یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ محقق اساتذہ کا ایک گروہ تازہ ترین ادب کے مطالعے کی طرف راغب نہیں ہو پاتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تحقیق کا یہ شوق خود ایک رجحان بنا دیتا ہے۔ مثلاً مخطوطہ شناسی ایک فن ہے۔ کسی قدیم مخطوطے کی دریافت اور تہذیب کا اپنا ایک لطف ہے، جو اس طرف گیا وہ اس رومان کا اسیر ہوا جو قدیم زبان، موضوعات اور مزاج کا زائدہ ہوتا ہے گویا وہ اس لذت سے محروم ہوا جو ہم عصر ادب کی عطا ہے۔ جن اساتذہ کے ہاں تنقید کا مزاج متعین ہو چکا ہے وہ بھی ایک ''محفوظ راستے'' کا انتخاب کر لیتے ہیں ۔ ان تخلیق کاروں کے حوالے سے موضوعات کا انتخاب جو پہلے سے اپنا ایک مقام بنا چکے ہوتے ہیں اور تنقید میں ان کا اتنا تذکرہ ہو چکا ہوتا ہے کہ سہولت سے مطلوبہ مواد اخذ کیا جا سکتا ہے، انہی پر ان کی نظر ٹھہرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ہاں جامعاتی تنقید میں ''مکھی پر مکھی مارنے'' کا چلن عام ہے۔ یہ صورت حال بھی تکلیف دہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحقیق کے لیے موضوعات احتیاط سے چننے کی ضرورت ہے، اور اس باب میں اساتذہ کا کردار بہت اہم ہے۔ اگر تعلیمی اداروں میں صورت حال مضحکہ خیز ہے تو اس کے ذمہ دار اس ادارے کے اساتذہ بھی ہیں۔

سوال: ایک ان دیکھا واقعہ کسی افسانہ نگار کے دل و دماغ میں کیسے جگہ بنا لیتا ہے کہ قاری اسے ایسا حقیقی واقعہ سمجھنے لگتا ہے جو اس کے تجربے میں رہا ہو؟

محمد حمید شاہد: لکھنے والے کا تخیل جتنا ہرا بھرا ہوگا، اتنا ہی وہ اِنسانی نفسیات کے قریب ترین

صورت حال کو گرفت میں لے لینے پر قادر ہو گا اور پڑھنے والا بہ قول غالب یہ محسوس کرے گا ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''۔ متخیلہ کے عقب میں مطالعہ اور مشاہدہ بھی کام کر رہا ہوتا ہے۔ افسانہ لکھتے ہوئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو آپ لکھ رہے ہوں، ویسا ہی عین مین آپ کے مشاہدے میں آیا ہو، بلکہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہونا ممکن ہونا چاہیے تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ایسا طبعی صورت میں ہوتا نظر آئے یا آ سکتا ہو بلکہ اس کا مطلب ہے کہ احساس اور خیال کی سطح پر اسے ہوتا دیکھ رہے ہوں۔ قاضی افضال حسین کے ایک مضمون میں، میں نے پڑھا تھا کہ جب عصمت چغتائی کا افسانہ ''لحاف'' پہلی بار چھپا تو اس کا آخری جملہ یوں تھا: ''ایک اِنچ اُٹھے ہوئے لحاف میں، میں نے کیا دیکھا، تو کوئی مجھے لاکھ روپے بھی دے تو میں نہیں بتاؤں گی۔'' منٹو نے یہ افسانہ پڑھا اور اس جملے پر معترض ہوئے کہ یہ ایک بچی کی زبان سے کہلوایا گیا ہے جو خلاف حقیقت ہے۔ حسب عادت یہ اعتراض عصمت چغتائی نے رد کر دیا مگر جب یہ افسانہ آخری شکل میں چھپا تو اسے عصمت نے یوں بدل لیا تھا: ''قلابازیاں لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اُٹھا۔۔۔ اللہ میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں۔'' بہ قول قاضی افضال حسین یہ بدلا ہوا اختتام راوی کی عمر کی مناسبت سے بالکل ٹھیک تھا۔ اب آپ دیکھیں کہ عصمت بچی تھی نہ منٹو اُس بچی جیسا جو غڑاپ اپنے بچھونے میں گھس گئی تھی، مگر دونوں کا تخیل اتنا ہرا بھرا تھا، کہ وہ ایک بچی کی نفسیات کے مطابق صورت حال کو آنک سکتے تھے۔ عصمت نے ابتدائی طور پر حقیقت کو سمجھنے میں اگر ٹھوکر کھائی تو منٹو کے معترض ہونے پر، اس پر پھر سے غور کیا اور ایک بچی کی نفسیات کو اپنے جملے میں قائم کر لیا تھا۔ یاد رہے ایک افسانہ نگار کو زبان کا تخیلی اور حساس ترین سطح پر تخلیقی اظہار کرنا ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنے قاری کی متخیلہ کو تحریک دِے کر ایک حقیقت کا تماشا اس کے سامنے سجا دِیتا ہے۔ میں نے

ایک جگہ لکھا تھا کہ میں فکشن لکھتا ہوں اور وہ سچ ہو جاتا ہے، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جتنا ہرا بھرا تخیل ہوگا اتنا ہی وہ اس حقیقت کے قریب ترین ہو جائے گا جو ہماری زندگیوں کو ایک نہج پر ڈالتی ہے۔ جی، حقیقت نہیں حقیقت کا تماشا۔ یہاں مجھے غالب کی ایک معروف غزل کا مطلع یاد آ گیا ہے: ''بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے/ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے''۔ جی، یہ دنیا، یہ زندگی، وہ جو ہم دیکھتے ہیں اور وہ جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں یا پھر نہیں دیکھنا چاہتے مگر دیکھتے ہیں، سب ایک تماشا ہی تو ہے اور ہم اس تماشے میں ایک پتلی کی طرح ہیں۔ ایک افسانہ نگار کے لیے حقیقت کا تصور (چاہے وہ دیکھی بھالی ہو یا ان دیکھی)، اس حقیقت سے انسانی سطح پر وابستہ ہونے کے بعد ہی قائم ہوتا ہے۔ محض بے جان پتلی ہو کر نہیں، ایک جیتا جاگتا زندہ وجود مگر پتلی۔ ''اسیر ذہن'' میں محمد سلیم الرحمن نے جون میک مرے کا ایک مضمون شامل کیا تھا ''حقیقت اور آزادی''، اس میں اس مصنف نے لکھا تھا کہ ہمارے رویوں کو براہ راست معین کرنے والی یا ہماری زندگی کے دھارے کو گرفت میں رکھنے والی حقیقت ہوتی ہے نہ حقیقی چیزیں، بلکہ زندگی کا دھارا وہ چیزیں متعین کرتی ہیں جنہیں ہم حقیقت یا حقیقی سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ ایک فکشن لکھنے والا یہیں سے اس حقیقت کو گرفت میں لیتا ہے جس نے ہماری زندگی کا رُخ متعین کیا ہوتا ہے، یہی فکشن کا واقعہ ہے اور اگر اسے تخلیقی سطح پر قائم کر لیا جائے تو یہ واقعہ قاری کی متخیلہ کو بھی اسی رُخ پر تحریک دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سوال: کسی ایک فن پارے کے متعلق ناقدین کی مختلف، یعنی مثبت اور منفی آرا کیوں ہوتی ہیں؟ اور کیا یہ بات درست ہے کہ ناقد جب تنقید کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل اپنے آپ کو بے نقاب کر رہا ہوتا ہے؟

محمد حمید شاہد: جی ہاں، یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ تنقید ناقد کو بھی بے نقاب کرتی ہے

۔صاحب نہج البلاغہ نے فرمایا تھا ''بولو کہ پہچانے جاؤ، کیوں کہ انسان کی شخصیت اس کی زبان کے نیچے چھپی ہوتی ہے۔'' لکھنا بھی، بولنے کی ایک توسیعی صورت ہے۔لکھا ہوا لفظ جہاں وہ نکتہ سمجھاتا ہے جسے سمجھانے کا قصد لکھنے والے نے کیا ہوتا ہے، وہیں لکھنے والے کی اپنی شخصیت کا بھرم بھی کھول دیتا ہے۔ایک ناقد کے باب میں تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اُتھلا ہے یا گہرا، کہاں سے کھڑے ہو کر بات کر رہا ہے، مرعوب ہے یا متاثر، کسی کے جملے اُگل رہا ہے یا دِل سے نکلی بات کہتا ہے۔تاہم میں نے 'ایک حد تک' آپ کی بات کو مانا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ناقد کا ایک فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ وہاں سے فن پارے کو نہ دیکھے جہاں وہ خود موجود ہوتا ہے، تھوڑی سی تکلیف کرے، اُٹھے اور وہاں پہنچے جہاں تخلیق کار نے موجود رہ کر ایک فن پارہ تخلیق کیا ہوتا ہے۔مصنف کے زمانے میں پہنچنا، جس زمین پر وہ موجود ہے اس زمین پر قدم رکھنا، جس کلچر اور تہذیب کا وہ پروردہ ہے اسے سمجھنا، یہ سب فن پارے کی بہتر تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں۔اس دوسرے فریضے کو تب تک سرانجام نہیں دیا جا سکتا جب تک ناقد اپنی 'میں' نہیں مارے گا، اپنے آپ کو بھول کر اور تخلیق کار کے نقطہ نظر کو نہیں سمجھے گا اور اپنے تجربے کی اسیری سے باہر نکلنے کے جتن نہیں کرے گا۔یاد رہے ہر شخص اپنے اپنے تجربے کا قیدی ہوتا ہے مگر ایک عمدہ ناقد اس قید خانے یا پنجرے کو توڑنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

اب میں آپ کے سوال کے پہلے حصے کی طرف آتا ہوں اور پوچھنا چاہوں گا کہ کیا سب انسان ایک سے ہوتے ہیں؟ سب کی پسند ناپسند ایک سی ہوتی ہے؟، سب نے زندگی کو ایک انداز میں برتا ہوتا ہے؟۔جب ہر ایک کا تجربہ اور ذوق الگ الگ ہے تو کسی فن پارے کی بابت ان کی ایک سی رائے کیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھیے فن ماپنے یا آنکنے کا پیمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک محلول کی طرح فن پارہ اس میں ڈال کر اور اس پیمانے پر بنے نشانات پڑھ کر اس کی

بابت فیصلہ کر لیں اور یہ فیصلہ، جو جو پیمانہ دیکھے، سب کا ایک سا ہو۔ تاہم آپ کی وہ تشویش بھی اپنی جگہ بجا ہے کہ اس باب میں مثبت اور منفی کا ادل بدل ہمارے ہاں سفاک ہونے کی حد تک ہونے لگا ہے۔ ادب میں یہ انتہا پسندی یا محض ذوقی رائے نہیں چلتی ایک فن پارے کو جانچنے کے کئی قرینے ہیں کہانی کیا ہے، پلاٹ کیسا ہے؟ پلاٹ ہے بھی یا نہیں؟ کہانی علامت بنی ہے یا محض ایک واقعہ ہو کر رہ گئی ہے؟، جس تیکنیک کو برتا گیا ہے کیا اس میں کہانی اپنا تخلیقی جوہر دکھا رہی ہے؟، برتی جانے والے زبان کیسی ہے؟ کرداروں اور ماحول سے مناسب رکھتے ہوئے جتنا ترفع زبان اور موضوع کو دیا جا سکتا تھا کیا دے لیا گیا ہے؟ موضوع کی انسانی حیات سے جڑت، اور مجموعی طور پر فکشن کی جمالیات کی تشکیل وغیرہ وغیرہ، ایک ناقد کے پاس تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے ہر ناقد اپنے مطالعے، مزاج اور فکری فنی رویوں کی روشنی میں فن پارے کا متن دیکھتا ہے اور اپنے تئیں فیصلے کرتا ہے جو محض منفی یا مثبت نہیں ہوتے، کئی سطحوں پر تعبیری اور فنی سطح پر تعین قدر کے باب میں ہوتے ہیں۔ وارث علوی نے کہیں لکھا تھا کہ ''تعبیر ایک خودسر' خود پسند مغرور حسینہ ہے۔'' اور درست لکھا تھا، کیوں کہ ایک عمدہ فن پارہ ایک پرت والا نہیں ہوتا، جس طرح ایک مغرور حسینہ کی ہر ادا آپ کو گھائل کرتی ہے، ایک اعلیٰ فن پارہ بھی ایسے ہی اپنے معبر پر پرت در پرت کھلتا ہے محض معنی اور مفہوم کی سطح پر نہیں اپنی مرتبہ جمالیات کے حوالے سے بھی۔ جمالیات کے اپنے اصول ہیں۔ پشکن نے جب یہ کہا کہ ''ننگی حسین نہیں ہوتی کھٹکتی ہے'' تو حسن کا ایک اصول بھی قائم کر دیا تھا، اس کا الف ننگا نہ ہونا۔ ایک آڑ، ایک اوٹ، ایک مہین سا پردہ حسین سے حسین تر وجود کو بھی چاہیے۔ ایک ناقد کو وہ قرینہ تلاشنا ہوتا ہے جو اس مہین پردے کی طرح فن پارے کی جمالیات قائم کر رہا ہوتا ہے۔ یہ سب فیصلے جس سطح کی سنجیدگی اور جس قسم کا سلجھا ہوا ذہن مانگتے ہیں وہ محض کسی پارے کو ''اعلیٰ'' یا ''گھٹیا'' قرار دے کر

مطمئن ہونے والا نہیں ہوسکتا۔

نند کشور وکرم

کابلی والا کی واپسی

میں حشمت خان کے اچانک غائب ہوجانے سے سخت پریشان تھا۔ معلوم نہیں وہ کہیں چلا گیا تھا یا کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی اُس کا اتہ پتہ نہیں مل رہا تھا۔ فکر کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو مجھے ملنے ضرور آتا کیونکہ وہ دو تین دن کے وقفے کے بعد مجھے ملنے آجایا کرتا تھا اور اگر بالفرض کسی وجہ سے نہ آپاتا تو ٹیلی فون پر ہی بات چیت کر لیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں مَیں نے اُس کے کئی ساتھیوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی اُس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میری چنتا بڑھتی جا رہی تھی...... بڑھتی جا رہی تھی۔

میرا آبائی وطن بنگال ہے جہاں کے مسحور کن نغمے اور حسیناؤں کی سیاہ لمبی زلفیں لوگوں پر جادو کر دیتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے بنگال کا جادو بھی مشہور ہے۔۔ لیکن شاید آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میری دادی کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اُن کے پتا بنگال کے بہت بڑے لیکھک تھے، وہی جنہوں نے کابل کے رہنے والے رحمت کے بارے میں ایک کہانی ''کابلی والا'' لکھی تھی اور جسے میری دادی یعنی مُنی سے بہت اُنس ولگاؤ تھا اور وہ جب بھی اُن کے گھر آتا تھا تو اُن کے لیے خاص طور پر کشمش بادام، اخروٹ، پستہ اور دوسرے خشک میوے لایا کرتا تھا۔ تب دادی بہت چھوٹی تھیں اور وہ گڑیا اور گڈے کی

شادی ایسے کھیلوں میں منہمک رہتی تھیں۔

آپ نے وہ کہانی پڑھی ہے یا نہیں لیکن اس کہانی پر مبنی فلم تو ضرور دیکھی ہوگی؟ خیر چھوڑیئے اُس لمبے قصے کو۔ اب تو اس قصے کو بیتے بھی لگ بھگ پون صدی گزر چکی ہے۔مگر مَیں نے یہ کہانی کئی بار پڑھی ہی نہیں اپنی دادی کی زبانی بھی سنی ہے جسے سناتے سناتے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔اب تو اُن کا انتقال ہوئے بھی عرصہ بیت چکا ہے لیکن مجھے اس بات پر انتہائی فخر ہے کہ میں اُس دادی کا پوتا ہوں جو کابلی والا کی ہیروئن تھیں اور جو کابلی والا کے آنے کا بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھیں۔حالانکہ ایک وقت تھا جب وہ اُس سے بہت ڈرتی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ میلے کچیلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے سر پر پگڑی باندھے، پیٹھ پر جھولی اور ہاتھوں میں انگوروں کے دو چار بکس اُٹھائے سڑکوں اور گلیوں میں گھومنے والے کابلی والا کی جھولی میں ننھے منے بچے ہوتے ہیں جنہیں وہ چوری چھپے اُٹھا کر لے جاتا ہے۔مگر آہستہ آہستہ اُس کا ڈر ختم ہوگیا اور دونوں کی خوب دوستی ہوگئی۔

شادی کے بعد میری دادی کلکتہ سے دہلی آ کر تیمار پور میں بنے ایک سرکاری کوارٹر میں رہنے لگیں کیونکہ میرے دادا کیلاش واسن سکرٹیریٹ میں ایک اچھے عہدے پر مامور تھے۔کئی برس تک وہ تیمار پور میں بنے سرکاری کوارٹروں میں رہنے کے بعد سنٹرل سکرٹیریٹ کے نزدیک گول مارکیٹ میں اپنا نجی مکان بنا کر رہنے لگے اور جب میرے والد کی شادی ہوئی تو پریوار بہت بڑھ گیا تھا لہذا میرے والد نے

چترنجن پارک میں ایک پلاٹ لے کر وہاں اپنا مکان بنا لیا۔میری پرورش و پرداخت وہیں ہوئی تھی اور یہاں امریکہ آنے سے پیشتر میں چترنجن پارک میں ہی رہا کرتا تھا۔

لیکن میں تو حشمت کی بات کر رہا تھا اور حشمت کا کابلی والے سے کیا رشتہ تھا جو

مَیں اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھ رہا ہوں؟

دراصل مَیں نے رحمت کابلی والا کی کہانی اتنی بار پڑھی اور سنی تھی کہ مجھے افغانستان اور وہاں کے باشندوں سے جذباتی لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ جب مَیں دہلی میں تھا تب بھی اگر مجھے کوئی پٹھان نظر آ جاتا تو مَیں اُس سے اُس کے اور اُس کے ملک کے بارے میں جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ایک دن جب کار خراب ہونے کی وجہ سے مَیں ٹیکسی ہائر کر کے کارٹریٹ سے مین ہٹن کی جانب جا رہا تھا تو اتفاق سے اُس کیب کا ڈرائیور بھی ایک پینتیس چالیس سال کا پٹھان نکلا۔ یہ اندازہ میں نے اُس کے ڈیل ڈول اور شکل وصورت لگایا تھا لیکن پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پاکستان کے صوبہ سرحد کا رہنے والا ہے یا افغانستان کا لہٰذا مَیں نے اس کی تحقیق کی غرض سے پوچھا۔

''خان صاحب! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔''

میرے سوال پر وہ چونک اُٹھا کیونکہ عام طور پر اس طرح کے سوال امریکہ میں پوچھنے کا رواج نہیں ،لوگ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ شاید اسی کارن اس سوال پر اُسے حیرت سی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ ثانئے تو جواب بھی نہیں دے پایا۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بنا پیچھے دیکھے ہی جواب دیا۔ ''جناب مَیں کابل کا رہنے والا ہوں۔''

کابل کا ذکر سُن کر پھر مجھے رحمت کی یاد آ گئی۔ اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''واہ! کابل؟ کیا خوبصورت جگہ ہے'' اتنی خوبصورت جگہ چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''صاحب۔ آدمی کو روزی کے لیے کہاں کہاں بھٹکنا نہیں پڑتا؟ میرے دادا پیسہ کمانے کے چکر میں ہندوستان کے شہر کلکتہ جایا کرتے تھے اور اب وقت بدل چکا ہے

صاحب! آج ہم لوگ پیسہ کمانے کے چکر میں امریکہ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' پھر مَیں نے اُس سے پوچھا۔'' کیا تم نے ہندوستان دیکھا ہے۔''

حشمت نے آہ بھری اور کہا۔''صاحب کچھ نہ پوچھئے بڑی دردناک کہانی ہے۔''

''اوہ' میں نے اظہار افسوس کیا اور استفسارانہ انداز میں پوچھا۔''کیا وہاں تمہارے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوگئی تھی؟''

''نہیں صاحب......دراصل مَیں خان حبیب اللہ صاحب کی فوج میں ملازم تھا۔ جب کابل کے چوک میں انہیں سر بازار پھانسی دیدی گئی تو مَیں اور میرے کئی ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مَیں بھاگ کر چھپتا چھپاتا پشاور پہنچ گیا اور پھر وہاں سے ہندوستان۔ کچھ دن تو مَیں امرتسر میں کابل کے ایک بیوپاری جسونت سنگھ میوہ فروش کے گھر پر مہمان رہا جو کابل میں ہمارا پڑوسی تھا۔ پھر دہلی آ کر اقوام متحدہ کے پناہ گزین کی حیثیت سے رہنے لگا ۔بعدازاں موقع ملنے پر یہاں امریکہ آ گیا۔'' پھر

اُس نے بنا پیچھے دیکھے سوال کیا۔''صاحب! کیا آپ نے کابل دیکھا ہے؟''

''نہیں۔لیکن مجھے دیکھنے کی خواہش ضرور ہے؟''

''کیوں؟ آپ کو کابل میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے اپنی دلچسپی کی وجہ کیسے بتاؤں۔ میں چند ثانئے چُپ ہوگیا اور پھر گویا ہوا۔''دراصل میری دادی کلکتہ کی رہنے والی تھیں۔ جب وہ کمسن تھیں تو اُن دنوں رحمت خان نامی ایک پٹھان وہاں آیا کرتا تھا۔ اور اُسے میری دادی سے بہت پیار ہوگیا تھا اور وہ ہمیشہ اُن کے لیے میوے لایا کرتا تھا۔''

''صاحب رحمت خان تو میرے دادا کا نام ہے۔ وہ بھی کلکتہ میں ہی بیوپار کرتے

تھے۔بچپن میں ایک بار انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایک بار اُن کا ایک بنگالی سے اس بات پر جھگڑا ہو گیا تھا کہ وہ اُن کا ادھار چکانے سے مکر گیا تھا۔اس پر انہوں نے مار پیٹ کی اور انہیں سزا ہو گئی تھی۔

''ہاں ہاں وہی رحمت۔وہی تو میری دادی سے ملنے آیا کرتے تھے۔جیل سے چھوٹتے ہی وہ دوسرے دن میری دادی سے سے ملنے آئے تھے مگر تب اُن کی شادی کے لیے منڈپ تانا جا رہا تھا اور اس مبارک موقع پر نانا نے رحمت کو کسی دوسرے دن آنے پر ٹال دیا مگر رحمت چاہتے تھے کہ وہ ایک بار منی یعنی میری دادی کو دیکھ لیں مگر میرے بڑے نانا نہیں مانے تب مجبوراً رحمت خان نے بہ عالمِ مجبوری واپس جانے کا ارادہ کیا اور جانے سے پہلے اُنہوں نے نانا جی کو ایک پوٹلی پکڑائی جس میں انگور اور تھوڑا سا کشمش اور بادام تھے۔وہ چاہتا تھے کہ یہ سوکھا میوہ مُنی کو دیا جائے۔نانا جی میوہ دیکھ کر پسیج گئے اور انہوں اُنہیں میوے کی قیمت دینے کے لیے
کچھ پیسے نکالنے چاہے تو انہوں نے جو بات کہی اُس نے نانا جی کو جھنجھور کر رکھ دیا۔تمہارے دادا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ آپ کی بڑی مہربانی بابو صاحب۔دراصل جس طرح آپ کی یہ بیٹی منی ہے اسی طرح کابل میں میری بھی ایک بیٹی ہے مَیں اُسی کا چہرہ یاد کر کے منی کے لیے یہ میوہ لایا ہوں،سودا کرنے نہیں۔
یہ واقعہ سُن کر حشمت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں دادا نے مجھے یہ بات بھی بتائی تھی'' پھر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔'' صاحب! آپ اُن کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں۔''

''حشمت خان! مَیں تمہارے دادا کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں کیونکہ میرے بڑے نانا بنگال کے بہت بڑے لیکھک تھے۔انہوں نے تمہارے دادا کی پوری

کہانی بڑی تفصیل سے ’’کابلی والا‘‘ کے نام سے لکھی تھی۔ اور پھر میری دادی نے بھی مجھے کئی بار وہ واقعات سنائے ہیں اس لیے مجھے اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔

’’اچھا‘‘

’’ہاں شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے دادا حشمت خان نے پیسے لینے سے انکار کرنے کے بعد اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے سے ایک میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر بڑے نانا کو دکھایا تھا، جو کوئی فوٹو گراف نہیں تھا، کوئی آئیل پینٹنگ نہیں تھی، کوئی اعلیٰ شاہکار نہیں تھا بلکہ اُس کی بیٹی کے ننھے ہاتھ کی چھاپ تھی جو ہاتھ پر تھوڑی سی سیاہی لگا کر لے لی گئی تھی۔ تب گھر والوں کے اعتراض کے باوجود انہوں نے لال چولی اور ماتھے پر چندن لگائے دلہن کے روپ میں شرماتی لجاتی مُنی کو اندر سے بلا کر تمہارے دادا سے ملوایا تھا۔‘‘

ان ہی باتوں میں ہم ’مین ہٹن‘ پہنچ گئے۔ اور مَیں نے اُتر کر ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لیے پرس کھولا لیکن اُس نے ٹیکسی سے اُتر کر میرا بازو پکڑ لیا۔ نہیں صاحب! آپ ہمارے بھائی ہیں۔ بھلا ہم آپ سے پیسے کیسے لے سکتے ہیں؟‘‘ مَیں نے بہت کوشش کی کہ وہ کرایہ لے لے مگر بہت اصرار کے باوجود بھی اُس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح برسوں پرانے جذباتی رشتوں کی تجدید ہو گئی......اور ہم لوگ اکثر ملنے لگے۔

ہماری گفتگو زیادہ تر موجودہ دور کی بے حسی اور ماضی کے کلکتہ اور کابل کے اِرد گرد گھومتی تھی جب انسانی قدروں کی تعظیم تھی، لوگ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ اور کسی طرح کی مذہبی منافرت کا نام و نشان نہ تھا۔

کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ حشمت کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے اور یہ کہ وہ بڑا دیندار اور متقی شخص ہے اور روزے نماز کا انتہائی پابند۔ وہ ہر مرض کا علاج

نماز میں ہی ڈھونڈ تا تھا اور ہر واقعہ کو خدا کی مرضی کہہ کر صبر کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگا۔ ''اللہ کی مرضی کے سامنے انسان کتنا مجبور ہے۔ ہم اس کی رضا کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اب دیکھئے نا میرے دادا کو کلکتے میں قید و بند کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اُن سے ایک شخص نے رام پوری چادر اُدھار لی تھی اور بعد میں روپے مانگنے پر اُس نے جھوٹ بول کر روپے دینے سے انکار کر دیا تھا اور انہیں بھدی بھدی گالیاں دی تھیں۔ کیا اپنے پیسے مانگنا جرم ہے؟ کیا کوئی گالی دے تو خاموش ہو جانا چاہیے؟ میرے دادا بھی تو گالیاں سُن کر غصے میں آ
گئے تھے اور اپنے چاقو سے اُسے زخمی کر دیا تھا۔ اور عدالت سے انہیں جان لیوا حملہ کرنے کے جرم میں کچھ برس کی سزا ہو گئی تھی۔ حالانکہ حقیقتاً اس میں قصوروار وہ شخص تھا جو ادھار دینے سے مکر گیا تھا اور مانگنے پر گالیاں دیتا تھا۔ مگر شاید اس میں اللہ کی مرضی تھی۔''

ہر بڑے سے بڑے المیہ پر اُس کا اللہ کی مرضی کہنا کبھی کبھی مجھے بہت کھلتا تھا۔ حتیٰ کہ جب ٹریڈ سینٹر کے ٹاور کو دہشت گردوں نے اُڑا دیا تو اُن دنوں بھی وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت نماز پڑھنے میں ہی لگاتا تھا۔ اُس نے اس اتنے بڑے واقعہ پر صرف ایک ہی فقرہ کہا تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے''۔ حالانکہ دہشت گردی کے اتنے بڑے واقعہ سے یہ شہر ہی نہیں ساری دنیا لرز اُٹھی تھی اور لوگ ہر وقت اور ہر لمحہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے ایک ایک منٹ کی خبر بڑی بے چینی اور بے تابی سے سنتے نیز اخبارات میں بھی اُس سے متعلق ہر خبر کو بڑے غور و انہماک سے پڑھتے اور دل ہی دل میں دہشت گردوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے یا آپس میں بیٹھ کر اسی پر تبصرہ کیا کرتے رہتے تھے۔ مگر حشمت کا ایک ہی جواب تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے۔'' یہاں تک کہ جب امریکہ نے طالبان کے خاتمے اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری کی غرض سے افغانستان کے شہروں پر بمباری شروع کر دی اور

شہر کھنڈروں میں تبدیل ہوگئے اور وہاں کے عوام کے بدن کلسٹر بموں سے چھلنی ہو جانے سے اُن کی رگ رگ میں بارود کی بو سما گئی کہ وہ سانس بھی لیتے تھے تو اُن سے بارود کی بو ہی باہر نکلتی تھی تب بھی وہ بڑی سنجیدگی سے یہی کہا کرتا تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے''

اُس کی یہ بات سُن کر کئی بار میرا تو صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور جی چاہتا کہ اُس سے پوچھوں کہ کیا خدا کی یہی مرضی ہے کہ افغانستان کے بے قصور اور معصوم افراد امریکہ کی کی منظم دہشت گردی کا شکار ہو کر ہزاروں کی تعداد میں لقمہء اجل ہو جائیں؟ لیکن اُس کی سنجیدگی نے مجھے ایسا کہنے سے ہمیشہ روکا۔ اور پھر جب عراق میں صدر صدام کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے امریکی فوجیوں نے ظلم وتشدد کی انتہا کر دی اور وہاں کی تہذیب وتمدن کو نیست و نابود کرنے میں چنگیز و ہلاکو کے ریکارڈ توڑ دیے تو اُن دنوں معلوم نہیں کیا ہوا کہ اُس کا آنا جانا یک لخت بند سا ہو گیا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ حشمت کہاں غائب ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کے کئی ساتھیوں سے بھی پوچھا مگر اُس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ ملا۔ گھر پر بھی ٹیلی فون کرنے پر آنسر مشین سے یہی جواب ملا۔ ''وہ فی الحال گھر پر نہیں، از راہ کرم اپنا پیغام چھوڑ دیں''

مَیں حشمت کے یوں غائب ہو جانے سے بے حد پریشان تھا کہ ایک دن اچانک صبح ہی صبح کسی نے کال بیل بجائی۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے حشمت کھڑا تھا۔ اُس کی شکل وصورت دیکھ کر حیرت واستعجاب سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ جیسے وہ صدیوں سے بیمار ہو۔ چہرے پر جھریاں یوں اُبھر آئی تھیں جیسے کسی بڑے جنکشن پر پھیلی ٹیڑھی میڑھی ریل کی لائنیں۔ اُس کا سرخ گورا چہرہ بھی اب کچھ تنبئی رنگ کا نظر آتا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کی چمک بھی مدھم پڑ چکی تھی۔ یہی نہیں اُس کا لمبا تڑنگا جسم بھی کچھ جھکا جھکا سا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ تھک سا گیا ہو یا کسی گہرے غم وفکر نے اُسے توڑ کر رکھ دیا ہو۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا حشمت بھائی! اتنے دن کہاں تھے؟''

وہ میرے پاس ہی صوفے پر دھیرے سے بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی تھکا ہوا ہے۔ مَیں نے اُٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا تاکہ پانی پی کر اس کے حواس کچھ درست ہوں۔ پانی پینے کے بعد اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''صاحب۔ کیا بتاؤں۔ ایک رات مَیں ٹیکسی پر گھر واپس آ رہا تھا کہ یکلخت پولیس نے راستے میں میری گاڑی روک لی اور مجھ سے کئی طرح کے سوال پوچھنے لگے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تم اسامہ بن لادن کو جانتے ہو؟ افغانستان میں تم کہاں رہتے تھے؟۔ پھر وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے اور بالآخر مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ مَیں آج ہی وہاں سے رہا ہو کر آیا ہوں اور اب دو دن بعد مَیں واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔

''اپنے ملک؟ افغانستان......؟''

''جی ہاں''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ مجھے تین دن کے اندر اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم ہوا ہے اور شاید یہی اللہ کی مرضی ہے۔ ویسے بھی اب یہ ملک اس قابل نہیں رہا کہ مسلمان یہاں رہے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ کسی شخص کے نام کے ساتھ محمد، احمد، حسن اور حسین دیکھ کر ہی اُسے کسٹم والے ہوائی اڈے پر روک لیتے ہیں اور اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔ انہیں ہر مسلمان دہشت گرد ہی نظر آتا ہے۔ اور انہیں اتنا ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے کہ خدا کی پناہ......

اُس کی باتیں سُن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا کہ اتنے برس امریکہ میں رہ کر بھی اُسے بنا کسی قصور کے دیش نکالا مل رہا ہے۔ میں کچھ دیر اس کی دلی کیفیت پر غور کرتا رہا اور چاہتا تھا

کہ اس سے کوئی سوال کروں کہ وہ بول اٹھا۔

''میرے اس دیس نکالے میں شاید اللہ کی مرضی شامل ہے۔شاید اللہ چاہتا ہے کہ مَیں اپنے ملک جا کر ودیشی طاقتوں کو ختم کرنے کی دوسرے حب الوطنوں کے ساتھ مل کر جنگ شروع کروں ۔آج امریکہ نے اقوام متحدہ کے ریزلیوشنوں کو ٹھکرا کر عراق میں جو دھاندلی کی ہے، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔اسی طرح افغانستان کی بھی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ان لوگوں نے طالبان اور اسامہ بن لادن کو ختم کرنے کے بہانے اپنی من پسند سرکار ہم پر تسلط کر دی ہے۔اور میرے دیش کو امریکی اڈے میں تبدل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔اس لیے میں وہاں جا کر ان بدیشی طاقتوں کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔اتنا کہنے کے بعد وہ یک لخت کھڑا ہو گیا اور رخصت ہونے کے لیے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔اُس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلچھلا رہے تھے اور اُس کے قدم من من کے بھاری ہو گئے تھے۔

وہ مجھے الوداع کہہ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا شام کے اندھیرے میں کھو گیا۔لیکن اُس کے جانے کے بعد بھی مَیں کئی لمحے دروازے پر کھڑا یہی سوچتا رہا کہ کیا رحمت اور حشمت کو ہمیشہ ہی نا کردہ گناہوں کی سزا ملتی رہے گی؟؟؟

OOO

خالد قیوم تنولی

اِک چراغِ رُخِ زیبا

کراچی سے ملازمتی تبادلہ ہوا تو بابل کا گھر چھوڑ کر ہم واہ کینٹ کو پیارے ہو گئے۔ یہ 1994ء کا سال تھا۔ تب سے کراچی اسی طرح جاتے ہیں جیسے بہت سے بچوں والی ماں دو چار سال میں ایک آدھ بار ہی اپنے میکے جا پاتی ہے۔

ہم تین دوستوں نے ایک مناسب سا گھر کرائے پر لیا اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ البتہ شروع شروع میں ایک دلچسپ صورتحال نے ہمیں حیران اور قدرے پریشان بھی کیا۔ ہوا یہ کہ ہمیں اس مکان میں منتقل ہوئے ابھی دوسرا دن تھا کی اطلاعی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا ایک صاحب کھڑے ہیں۔

پوچھا۔ نے

ہیں؟"

ہیں۔" رہتے

گئے۔ بڑھ آگے

اس کے بعد بھی متعدد صاحبان آئے اور اتفاق سے ہم ہی ان کے مقابل گئے۔ وہی سوال کہ آنٹی کیوی ہے؟

اور ہم کہتے جی نہیں۔ یہاں ہم رہتے ہیں۔ یہ حیرانی کا باعث تھا۔ لیکن پریشانی تب ہوئی جب ایک ایسے ہی انجان ملاقاتی نے ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ بائیں آنکھ دبا کر پوچھا:

کل۔" آج ہیں

ہم نے ترنت جواب دیا:" جب آنٹی کے اتنے سارے بھانجوں یا بھتیجوں کو معلوم نہیں تو ہم کیسے بتا سکتے ہیں بھئی۔ بجائے ہم سے پوچھنے کے آپ سب مل کر اپنی آنٹی کی گمشدگی کی تھانے میں رپٹ درج کرائیں۔"

اور ہم نے دروازہ بند کر دیا۔

اپنے ہاؤس میٹس سے ذکر کیا تو دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا:

"It is not a burning issue at all."

ہم نے کہا:" یارو! پھر بھی جاننا چاہیے کہ یہ آنٹی کیوی ہیں کون جن کی پورے شہر میں ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے۔"

ایک جو ذرا زیادہ میٹر آف فیکٹ کا قائل تھا اور اپنے سیاسی اور عمرانی اصولوں پر سختی سے کاربند بھی بولا:

"Sweep before your own door."

ہم نے بظاہر چُپ سادھ لی مگر ایک ہڑک اندر ہی اندر تازہ کیے رکھی۔ گھر سے ملحق جس کریانہ کی دکان سے ہم روزمرہ کی اشیاء خریدتے تھے۔ اس کے مالک ایک سن رسیدہ شخص جو حاجی صاحب کہلاتے اور بظاہر بہت سنجیدہ دکھائی دیتے تھے ان سے ہم نے بعد از گپ شپ آنٹی کیوی کے متعلق استفسار کیا۔ سنتے ہی حاجی صاحب دفعتاً خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گئے۔ فرمایا:"نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ آخرت کی فکر کرو۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ کچھ اور چیز تو نہیں خریدنی آپ نے؟"

ہم کان لپیٹ کر موقع سے ہٹ گئے۔

کبھی کبھار کوئی نہ کوئی آنٹی کیوی کا پرستار آ نکلتا۔ ایک بات ہم نے ضرور نوٹ کی کہ ان برہہ کے ماروں میں ہر عمر کے لوگ تھے بچوں کے علاوہ۔ لیکن ایک نے بھی آنٹی کیوی کے

بارے خاطر خواہ معلومات بہم نہ پہنچائیں۔ بس وہ آتے پوچھتے اور پلٹ جاتے۔ ہر بار نو وارد مختلف ہوتا۔ حتیٰ کہ ان میں چند عورتیں جن کے نقابوں میں سے صرف کجرارے نین جھلکتے تھے، اور آواز کے لوچ و آہنگ سے ہم ان کی درست عمروں کا کچا پکا تخمینہ لگاتے رہے مگر ہمیں اس گورکھ دھندے کی سمجھ نہ آتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ کئی ماہ تک اطلاعی گھنٹی نہ بجی۔ اپنے ساتھیوں سے پوچھا تو ان کا جواب بھی نفی میں تھا۔ گویا گاہکوں کو دکان کی دائمی بندش کا یقین آ چکا تھا۔

ہمارے دونوں ہاؤس میٹس کو یوتھ ہاسٹل میں رہائش مل گئی اور ہم تنہا رہ گئے۔ عید الفطر کی تعطیلات میں بوجوہ کراچی نہ جا سکے۔ عید سے اگلے دن آنکھوں میں اترتی دھند میں تنہائی کا میلہ سجائے لیٹے تھے کہ اطلاعی گھنٹی چیخ اٹھی۔ سوچا ہو گا کوئی دفتر کا ساتھی۔ دروازہ کھولا تو خود کو ایک خاتون کے سامنے پایا۔

تھے کرنے کو

کہ وہ خاتون بولیں: "جانتی ہوں۔۔۔ اگر برا نہ مانیں اجازت ہو تو میں کچھ دیر کے لیے اندر مطلب بیٹھوں گی نہیں بس کچھ لمحات کے لیے گھر کے در و دیوار کو دیکھنا چاہوں گی۔"

ت ت

۔۔۔تو۔۔۔ ایک قطعی اجنبی خاتون کو ہم کیسے۔۔۔؟" ہم منمنائے۔ اور وہ ہمیں ٹوک کر بولیں:

۔۔۔" بار آخری

گئے۔ سے پگھ

گھر میں دیکھنے کو کیا تھا در و دیوار ہی تو تھے۔ سو وہ ہماری تقلید میں اندر آ گئیں۔ ایک لنگڑی سی کرسی ہم نے انہیں پیش کی مگر وہ بیٹھی نہیں۔ دو کمرے خالی پڑے تھے۔ تیسرے میں ہمارا مختصر سا اثاثہ منتشر پڑا تھا۔ متاعِ فقیر میں فرشی بستر، چند کتابیں، مطالعے کی میز کرسی، مالک

مکان کا ازراہِ کرم چھوڑا ہوا ایک اذکار رفتہ فریج جسے ہم نے الماری کا شرف بخش رکھا تھا۔ اس میں ہمارے دھلے ان دھلے کپڑے اور جوتے پوشیدہ تھے۔ فریج کے اوپر پانی کا کولر تھا جس کی ٹونٹی کو ہر وقت زکام لاحق رہتا۔ ہم نمائندۂ تشریفات کی صورت شرمندہ شرمندہ سے کھڑے رہے۔ اور وہ خاتون دیوار و در پر حسرت کی نظر دوڑاتی پھریں۔ آؤ بھگت کی خاطر ہم نے باورچی خانے کا رخ کیا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم مہمان کی چائے سے ہی تواضع کی جائے۔

چائے بن چکی تو ہم نے ممکنہ سلیقے سے بسکٹ و کھجوروں کے ساتھ پیش کرنا چاہی ۔۔۔ مگر دیکھا کہ وہ لنگڑی کرسی پر فروکش اپنے آنسو پونچھ رہی ہیں۔ سخت تعجب ہوا۔ ہم نے تمام میسر لوازمات نہایت مؤدب خاموشی سے ان کے سامنے ایک سٹول پر سجا دیے۔۔۔

اب وہ نقاب اتار چکی تھیں۔ اور ایک شفیق سے تبسم کا غبار ان کے لبوں پر تحلیل ہوتا جاتا تھا۔ وہ دھوپ چھاؤں کا منظر ہمیں بھلا لگا۔ اپنی آبنوسی رنگت کے باوجود وہ دلکش نقوش کی حامل تھیں۔ عمر تقریباً پچاس پچپن کے بین بین ہوگی۔ ناک کے لونگ سے شعائیں پھوٹ رہی تھیں اور سیاہ فراخ آنکھوں میں برمودا تکون جیسے اسرار۔ سامان خورد و نوش پر نگاہ کی بولیں:

تھی۔؟" ضرورت کیا

ہم نے کہا: "آپ مہمان ہیں۔ تکلف کو مزید کچھ ہوتا تو بخوشی پیش کرتے ۔۔۔ لیکن جو موجود تھا وہی حاضر خدمت ہے۔ زحمت کا ہے کی۔ ہم تو شرمسار ہیں کہ آپ اس سے زیادہ کی مستحق ہیں۔"

گئے۔ سے جھینۓ

چائے کی چسکیوں کے دوران ہم چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتے گئے اور وہ بڑی متانت اور شگفتگی کے ساتھ بتاتی گئیں ۔۔۔ اور ہم ملول و مغموم ہوتے رہے۔

ان کے بقول کہ نہ وہ اپنے جنم استھان سے واقف ہیں اور نہ ہی جنم دینے والوں سے۔ ہوش سنبھلتے

ہی خود کو بکتے دیکھتی آئیں۔ متعدد ہاتھوں سے گزریں۔ آخر تجربات نے خود مختار کیا۔ ایک شخص کے ساتھ حیدر آباد شہر پولیس کے بھتے سے تنگ آکر چھوڑا۔ سترہ سال اسی مکان میں گزارے۔ پانچ ناجائز بچے پیدا کیے جو بد قسمتی سے جانبر نہ ہو سکے۔ زندہ رہتے تو بڑھاپے کا سہارا ہوتے۔

مایوس اور

ہو کر بیٹھ گئے۔؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا: "ایک سال پہلے یہ مکان میں نے فروخت کر دیا۔ تھک گئی تھی۔ پیشہ کرتے اور کراتے کراتے۔ نفرت ہو گئی تھی۔ دارالامان میں اٹھ گئی۔ وہاں کوئی نہیں جانتا میرے ماضی کو۔"

ہم نہ رہ سکے تو پوچھ لیا: "پھر چھوڑی ہوئی منزل کی یاد کیوں آئی؟"

زاروقطار رونے لگیں۔ ہم نے ڈھارس بندھانے کو ان کا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے تھپتھپایا۔ ذرا سنبھلیں تو کہا: "انسان جہاں گناہ کرے تو توبہ بھی وہیں کرنی چاہیے۔ میں آج یہاں اسی لیے آئی۔"

اب ہمارے آنسو نہ رک سکے۔ پُرنم پلکوں سے ان کے ہاتھ کو چوم لیا۔

دوبارہ گویا ہوئیں: "زندگی کوچۂ کوفہ میں گزاری۔ مرنے کی تمنا آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگری لے جا رہی ہے۔ اب من کی کالک وہیں دھوؤں گی۔ خوب روؤں گی۔ بخشش کے لیے شفاعت لازم ہے۔"

اور جب ہم انہیں بس سٹاپ تک چھوڑنے جا رہے تھے تو آخری سوال پوچھا: "آپ کا اصل نام تو یقیناً خوبصورت ہو گا لیکن یہ آنٹی کیوی کیوں؟"

سن کر ٹھٹھک گئیں۔ رنج کی ایک لہر سی ان کے ماتھے پر ابھری۔ پھر سر کو ہلکے سے جھٹک کر کہا: "یہ نام تو میں آج پہلی بار سن رہی ہوں۔۔۔ ورنہ مجھ جیسیوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

ہما فلک

بوجھ

چار برس بعد ناراض بہن سے ملنے کا منظر بڑا دلگیر تھا۔ دونوں بہن بھائی کتنی دیر ایک دوسرے سے گلے ملے آنسو بہاتے رہے۔ ان دونوں کے شریک حیات اور بچے اس منظر سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔

کچھ دن پہلے اظہر عائشہ کی طرف اس کو منانے گیا تھا۔ اور آج عائشہ سارے گلے شکوے دور کرنے چلی آئی۔ تین دن بھائی کے پاس رہی اور بھائی نے ان تین دنوں میں بہنوئی کو اس بات پر رضا مند کر لیا تھا کہ اس چھوٹے سے قصبے کو چھوڑ کر شہر آ جائیں۔ کیونکہ شکیل صاحب کا ارادہ اپنے بیٹے شارق کو ورک شاپ کھول کر دینے کا تھا۔ مرد حضرات تو کاروباری گھتیاں سلجھا رہے تھے جب کہ خواتین کوئی اور ہی معاملہ لے کر بیٹھی تھیں۔ ان تین دنوں میں عائشہ نے نازیہ کے انداز و اطوار کا بغور جائزہ لیا تھا۔ بالآخر شکیل صاحب کی اجازت سے اس نے غزالہ سے بات چھیڑ دی۔

''اپنی نازیہ ماشاءاللہ سیانی ہو گئی ہے۔ کہیں بات چلائی اس کی؟''

''کہاں آپا، لوگ سیانا نہیں دانہ دیکھتے ہیں۔ ہمارے گھر کس نے جھانکنا ہے، جو باہر سے ہی اندر والوں کا حال بتا دیتا ہے۔''

''بس پھر بھائی کی بیٹی پر پہلا حق میرا ہے، نازیہ آج سے میری بیٹی ہے۔'' بھائی بھاوج کو بھلا کیا اعتراض ہوتا؟ نازیہ کا رنگ روپ اور اٹھان دیکھ کر ماں کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں، جبکہ سارا دن جان مار کے بھی بمشکل گزر بسر کرنے والا اظہر جہیز کہاں سے اکٹھا

کر پاتا؟ اس بات نے اس کا سکون لوٹ لیا ہوا تھا۔ بہن نے اسے ہر فکر سے آزاد کر دیا۔

بچوں کو ابھی اس سارے معاملے کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی ،لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ نازیہ کے کانوں میں اس بات کے کچھ الفاظ پڑ چکے ہیں جہاں سے وہ بات کی تہہ تک پہنچ کر آنکھوں میں ست رنگے خواب بھی سجا چکی ہے۔ جبکہ شارق اور نازیہ کا بھائی ندیم اس وقت گھر نہ ہونے کی وجہ سے بے خبر ہی رہے۔ ابھی شارق صرف اٹھارہ کا تھا۔ اور نازیہ سولہ برس کی اس لیے طے یہی پایا کہ یہ بات صرف ان چاروں کے درمیان رہے۔ اور جب دونوں شادی کے قابل ہو جائیں تب ان کو بتایا جائے۔

دو سال بہت تیزی سے گزرے۔ اس دوران میں نہ سرف شارق نے اپنی ورک شاپ سیٹ کر لی تھی۔ بلکہ شکیل صاحب نے اظہر کے سامنے والا گھر بھی خرید لیا تھا۔ غزالہ ہونے والے داماد کی یہ ترقی دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ ادھر عائشہ بھی نازیہ کا سلیقہ طریقہ دیکھ کر اپنے فیصلے پر خوش تھی۔ اور اب تو شارق کی آنکھوں میں بھی نازیہ کے لیے پسندیدگی دیکھ کر اسے مزید اطمینان ہو گیا۔ عائشہ نے ابھی شارق کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ جبکہ غزالہ جان چکی تھی کہ نازیہ اس بات سے بے خبر نہیں۔ اس لیے وہ اسے اب اس کے جہیز کی تیاری میں ساتھ رکھنے لگی تھی۔ نازیہ نے بھی چادروں اور میز پوشوں پر دھاگے سے کچی عمر کے خواب کاڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

طے یہی پایا تھا کہ اگلی کمیٹی ملتے ہی منگنی کا اعلان کر کے بچوں کو اور خاندان کے دیگر لوگوں کو اس بارے میں بتا دیا جائے گا۔ اور شادی کی تاریخ بھی رکھ دی جائے گی۔

''چاچی باہر آئیں، ندیم بھائی اور شارق بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں۔'' گلی کے شرجیل نے گھبرائے ہوئے انداز میں آ کر اطلاع دی۔ عائشہ پہلے ہی باہر جا چکی تھی۔ گلی سے نکل کر سڑک پر دونوں لڑکے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ مشکل سے دونوں کو الگ

کیا گیا۔ندیم سخت بپھرا ہوا تھا۔وہ بار بار شارق پر حملہ آور ہو رہا تھا۔جبکہ شارق کی ساری توجہ اپنے دفاع پر مرکوز تھی۔

گھر آ کر بھی ندیم شارق کو گالیاں دیتا رہا۔غزالہ پوچھ پوچھ کر تھک گئی لیکن ندیم کچھ بتانے پر راضی نہ تھا۔اس نے نازیہ کو سختی سے پھپھو کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔''ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گا اگر میں نے ان کے گھر کے آگے سے بھی تمہیں گزرتے دیکھا۔شکیل صاحب اور اظہر کو اس سارے معاملے کی خبر باہر سے ہی ہو چکی تھی۔گھر آ کر دونوں اپنے اپنے طور پر پوچھتے رہے۔لیکن دونوں میں سے کوئی بھی لڑائی کی وجہ بتانے پر راضی نہ تھا۔اس لیے لڑائی کی وجہ ایک معما بن رہ گئی۔اس پر ندیم کا سخت رویہ کہ نازیہ کسی صورت بھی پھپھو کی طرف نہیں جائے گی،غزالہ کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔نازیہ الگ پریشان، کہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی جو دونوں گھروں کے لیے قابلِ اعتراض ہوئی اور غصے میں آ کر انہوں نے رشتہ ہی ختم کر دیا تو کیا ہوگا؟۔سوچ سوچ کر اس نے خود کو بیمار کر لیا۔

ادھر عائشہ کی بھی یہی حالت تھی۔ابھی ایک دن پہلے ہی تو اس نے شارق کو اس کی نازیہ سے نسبت کے بارے میں بتایا تھا۔اور شارق نے جس شدت سے خوشی کا اظہار کیا تھا اگلے ہی دن ایسی لڑائی کی نوبت کیوں آئی تھی۔وہ سمجھنے سے قاصر تھی، نہ ہی شارق کچھ بتانے پر راضی تھا۔

اب غزالہ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ندیم کو بھی اس بارے میں بتا دے۔وہ خود اس سے بات کرتے گھبراتی تھی۔سو یہ کام اس نے اظہر کے ذمے لگا دیا تھا۔ندیم کو باپ سے جب اس بات کا پتہ چلا تو باپ سے اس نے کچھ نہیں کہا لیکن ماں سے گلہ کیا کہ میں آپ کا بیٹا تھا۔مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟۔اب اس پر نازیہ کی بیماری کی وجہ بھی کھل چکی تھی،اس لیے اس دن اس کے سرہانے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

’’یہاں عاشقی، معشوقی میں چارپائی بھی پکڑلی، اور سگے بھائی کو کچھ بتانے کے قابل بھی نہیں سمجھا۔‘‘

کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب اپنے معمول پر آنے لگا۔لیکن نازیہ اب بھی بھائی کی موجودگی میں پھپھو کی طرف نہیں جاتی تھی۔ندیم رشتہ کے متعلق جان کر بھی اسے ذہنی طور پر قبول نہ کر سکا اور ناراض ناراض پھرا کرتا۔

شادی کی تاریخ تین مہینے بعد کی طے پائی کہ ندیم کی موت کی خبر ان سب پر قیامت بن کر ٹوٹی۔

ندیم اور شارق موٹر سائکل پر دوسرے گاؤں گئے تھے۔وہیں ایک حادثے میں شارق کو بہت سی چوٹیں آئیں، جبکہ ندیم بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے جانبر نہ ہوسکا۔اور موقع پر ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔یہ حادثہ دونوں خاندانوں کے لیے بہت بڑی آزمائش تھا۔شارق تو کچھ دن ہسپتال رہ کر گھر آ گیا۔لیکن غزالہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو کر جیسے پتھر کی بت بن کر رہ گئی۔

زخم کتنا بھی گہرا ہو، وقت کا مرہم اسے مندمل تو نہیں کرتا لیکن درد کی شدت میں کمی ضرور آجاتی ہے۔تین ماہ بعد بہت سادگی سے نازیہ اور شارق کی شادی کر دی گئی۔رخصتی کے وقت بھائی کو یاد کر کے نازیہ تڑپ تڑپ کر روئی۔بہت مشکل سے اسے سنبھالا گیا تھا۔پھر شارق کی بے پناہ محبت نے اس کے دکھ پر مرہم رکھ دیا۔

’’تم جانتی ہو جب میں پہلے تمہارے گھر آیا تھا۔تم اس وقت یہی کوئی گیارہ بارہ سال کی تھیں۔میں نے تمہیں اتنا تنگ کیا تھا۔کہ تم بھاں بھاں کر کے رونے لگی تھی۔‘‘

شارق کبھی کبھار اسے چڑانے کے لیے یہ قصہ لے بیٹھتا۔اور جب وہ چڑ جاتی تو اسے بتاتا کہ اس وقت ہی وہ اسے اچھی لگی تھی۔پھر چار سال بعد اسے دیکھا تھا تو حیران ہی رہ گیا تھا

۔اور اگر اس کی والدہ یہاں بات نہ بھی چلاتیں تو وہ خود ان سے کہہ دیتا۔

''شارق میں تو آپکی بیوی ہوں مجھے تو بتا دیں کہ آپکی لڑائی اس وقت کس بات پر ہوئی تھی؟'' وہ شارق کو کبھی کبھار کریدتی لیکن وہ اٹھ کر چلا جاتا یا پیار سے اسے بہلا لیتا۔نازیہ کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔اور یہی بات اسے پوچھنے پر اکساتی تھی۔وہ ویسے بھی ہر بات میں ندیم کا ذکر ضرور کرتی اس کی پسند ناپسند اس کی عادتیں وغیرہ۔اس دن اس نے مرغی کا پلاؤ بنایا تھا۔دستر خوان لگا کر شارق کے سامنے بیٹھی اور چاول نکالتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس دن سے ایک رات پہلے چکن پلاؤ بنا تھا۔ندیم کو پچھلے دن کا چکن پلاؤ بہت پسند تھا،اور وہ ہمیشہ اپنی ایک پلیٹ علیحدہ نکلوا کر رکھتا تھا کہ وہ اگلے دن کھائے گا۔۔۔۔اور اس دن بھی اس کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔۔۔۔وہ باہر نکلا اور پھر واپس اندر آیا۔اور آ کر کہنے لگا ''موٹی میرا پلاؤ نہ کھانا میں آ کر کھاؤں گا''۔اور پھر وہ نہیں آیا۔'' کہتے کہتے نازیہ کی آواز بھرا گئی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔شارق نے کچھ لمحے اسے دیکھا اور پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔نازیہ کو اس کے اس رویئے پر حیرت ہوئی۔وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

''شارق آپ کو کیا ہوا ہے؟ اس طرح کھانا چھوڑ کر کیوں آ گئے؟ آپکی پسند کا پلاؤ بنایا ہے۔''

''دیکھو نازی! ندیم تمہارا بھائی تھا۔اور میرا بیسٹ فرینڈ اور بھائی بھی، حادثے کے وقت میں اس کے پاس تھا۔میرے ہی ہاتھوں میں۔۔۔۔۔اس نے آخری سانس لی تھی۔'' شدید کرب کی کیفیت شارق کے چہرے پر عیاں تھی۔نازیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم جب جب اس کا ذکر کرتی ہو، وہ واقعہ پوری تفصیل سے میری آنکھوں کے

سامنے آجاتا ہے۔ہم اسے بھول نہیں سکتے۔ بھلایا جا بھی نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔لیکن یوں۔۔۔۔۔''شارق بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

''نازی ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنا ہو گی تاکہ اس غم کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔

''جی شارق۔۔۔۔!'' نازیہ نے آہستگی سے کہا۔اس کا ذہن بہت بری طرح سے الجھ گیا تھا۔

اگلے دن وہ اپنی امی کی طرف آئی۔اورانہیں ساری بات بتا کر مشورہ چاہا۔

''امی مجھے خود پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔جب ندیم کی یاد آتی ہے میں خود کو روک نہیں پاتی ہوں۔کیا کروں؟''

''دیکھو نازیہ۔۔۔ یہ تمہاری نئی زندگی کی ابتداء ہے۔جانے والا چلا گیا۔مجھ سے زیادہ اس کے جانے کا غم کس کو ہوگا؟ مجھے لگتا ہے میری انتڑیاں اندر سے کوئی کھینچ رہا ہے۔اس کی یاد دن رات ہر سانس کے ساتھ میرے ساتھ ہے۔۔لوگوں سے ملتی جلتی ہوں باتیں کرتی ہوں ہنستی بولتی بھی ہوں۔لیکن میں اندر سے مر چکی ہوں۔

تم اپنی زندگی کا آغاز اچھے طریقے سے کرو۔شوہر کو وقت دو اور ہر وقت اس سے بھائی کا ذکر نہ کرو۔اس کے لیے اس حادثے کو اپنے سامنے دیکھ لینے کے بعد یہ سب سہنا کتنا مشکل ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' نازیہ نے ماں سے عہد کرلیا کہ اب وہ کبھی ندیم کا ذکر شارق سے نہیں کرے گی۔جب بہت یاد ستاتی تو ماں کی طرف آجاتی۔ جہاں وہ دونوں ایک دوسرے سے کہہ سن کر خود کو ہلکا کر لیتی تھیں۔

اور پھر زندگی اپنے معمول پر رواں دواں ہو گئی۔شارق کی بے پناہ چاہت او نازیہ کے خلوص اور محبت نے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

O

'' شارق کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟ کچھ بتاتے بھی نہیں دن بہ دن چڑ چڑے ہو رہے ہیں۔ کبھی کوئی برتن توڑ دیتے ہیں کبھی کچھ اور۔ ذرا سی بات پر غصہ کرنے لگتے ہیں۔ پہلے صرف الجھے ہوئے اور سوچ میں کھوئے ہوئے رہتے تھے، اب چڑ چڑاہٹ ان کے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔''

'' تو تم نے پوچھا نہیں اس سے؟ کیا کہتا ہے؟

سعدیہ، کل سے آئی ہوئی تھی۔ اور شارق کا رویہ اسے عجیب سا محسوس ہوا تو پوچھ بیٹھی تھی۔

'' میں پوچھتی ہوں تو اول تو کوئی جواب نہیں دیتے۔ دوسری تیسری دفعہ پوچھوں تو غصہ کرنے لگتے ہیں۔ چیختے چلاتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ بچوں سے بھی ان کا رویہ ٹھیک نہیں۔ میں ڈرتی ہوں جوان بچے ہیں ان سے کہیں کوئی بے ادبی سرزد نہ ہو جائے۔''

'' کوئی کام وغیرہ پر مسئلہ تو نہیں ہے؟''

'' نہیں آپی کام تو اب دونوں لڑکے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ تو زیادہ تر گھر ہی ہوتے ہیں، ویسے بھی اللہ کا شکر ہے کہ وہاں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو پریشان کن ہو۔''

'' تم نے ڈاکٹر کو دکھایا؟'' سعدیہ نے فکرمند انداز میں پوچھا۔

'' ایک دو بار کہا تھا ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں الٹا مجھ سے ہی ناراض ہونے لگے۔ کہ میں تمہیں پاگل نظر آتا ہوں، بیمار لگتا ہوں؟ تم خود پاگل، خود بیمار ہو۔''

'' اچھا اگر وہ تمہارے پوچھنے پر چڑتا ہے تو کچھ دن اسے بالکل نہ پوچھو، اور گھر میں کوئی بھی بات اس کے مزاج کے خلاف نہ ہونے دو۔''

'' جی آپی اب کوشش کر کے دیکھتی ہوں، آپ بھی اپنے بھائی سے بات کر کے دیکھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو بتا دیں۔''

''اچھاتم پریشان نہ ہو میں دیکھتی ہوں۔''

لیکن سعدیہ کے بات کرنے کا اثر اور بھی الٹا ہوا۔ اس نے سب کے سامنے ہی نازیہ کی بے عزتی کر دی۔ ''تم کیا لوگوں میں مجھے پاگل مشہور کرنا چاہتی ہو؟''

''میں کوئی۔۔۔لوگ۔۔نہیں تمہاری سگی بہن ہوں۔'' سعدیہ کو واقعی دکھ ہوا تھا۔

''بہن ہو، یہاں آئی ہو تو آرام سے دو چار دن جو رہنا ہے رہو، اور خوش خوش اپنے گھر جاؤ۔ مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں پاگل ہوں اور تم سب کو مجھ سے ہمدردی ہے۔''

شارق کے اس رویئے سے سعدیہ کو بہت رنج ہوا۔ اسے یہ بھی احساس ہوا کہ نازیہ کن حالات سے دو چار ہے۔ وہ اسے صبر سے حالات کا سامنا کرنے کی تلقین کر کے گھر آ گئی۔ اظہر کا انتقال ہو چکا تھا، جبکہ غزالہ کو بیٹے کے غم نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ عائشہ اور شکیل صاحب بھی وفات پا چکے تھے۔ اس لیے سعدیہ ہی تھی جس سے نازیہ اپنی پریشانی کا اظہار کر سکتی تھی۔ لیکن وہ بھی اس کی کچھ مدد نہ کر سکی اور معاملہ سدھرنے کی بجائے بگڑتا ہی چلا گیا۔ تینتالیس برس کی عمر میں ہی شارق کا پورا سر سفید ہو گیا، وہ اپنی عمر سے دس برس بڑا نظر آنے لگا تھا۔ نازیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کون سی پریشانی ہے جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شارق کی تمام قوتیں جواب دینے لگیں اور پھر وہ بستر سے ایسا لگا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔

''نازی یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' کافی دن بعد شارق کی حالت سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی اور وہ اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ نازیہ نے اسے دیکھ کر شکر ادا کیا اور اسکے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''نازی میرے دل پر ایک بوجھ بھاری پتھر کی طرح پڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے جب تک میں اسے کہہ نہیں دوں گا میں سکون سے مر بھی نہیں سکوں گا۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں شارق؟ آج تو آپ کافی بہتر نظر آ رہے ہیں انشاء

اللہ آپ جلد ہی مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔'' یہ بات دونوں ہی جانتے تھے کہ یہ محض طفل تسلی ہے ورنہ ایک ہفتہ قبل ہی ڈاکٹرز ہر قسم کے علاج سے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔

''نازی مجھے کہہ لینے دو۔ میں نے زندگی کے کتنے ہی سال اس کرب میں گزارے ہیں، راتوں کو تڑپتا رہا ہوں، اور تمہیں کبھی اس بات کا پتا نہیں چلنے دیا۔ مگر اب میں اندر سے ٹوٹ چکا ہوں۔ اور مکمل بکھرنے سے پہلے یہ بوجھ خود پر سے اتار دینا چاہتا ہوں۔''

''کیسا بوجھ شارق۔۔۔؟'' نازیہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''اس دن میری اور ندیم کی لڑائی بہت معمولی بات پر ہوئی تھی۔ بچپنے کے وہ راز جو ہم ایک دوسرے کو بتاتے اور ہنستے، جب کبھی لڑائی ہونے لگتی تو ایک دوسرے کو ڈراتے تھے کہ تمہاری بات سب کو بتاؤں گا۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنا راز بتایا تو اس نے کہا کہ میں یہ بات سب کو بتاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ میں نے بھی اسے مذاق میں کہا کہ بتاؤ بے شک اپنے ہی بہنوئی کو بدنام کرو گے۔ مجھے امی نے ایک دن پہلے ہی ہماری منگنی کے بارے میں بتا دیا تھا، میں نے سوچا کہ اسے پتا ہوگا۔ لیکن وہ لاعلم تھا اس لیے بپھر گیا۔ اس کے بعد جو بھی ہوا تم جانتی ہی ہو۔ لیکن ایک بات ہے جو تم نہیں جانتیں۔۔۔ بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

''کون سی بات۔۔۔'' نازیہ سے یہ وقفہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''ندیم کی موت حادثہ نہیں میری غلطی تھی۔ غلطی بھی ایسی کہ میں چاہتا تو وہ بچ سکتا تھا لیکن۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔ کیا؟'' نازیہ نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''میں نے اسے مرنے دیا۔ میں دیکھتا رہا۔ میں چاہتا تو اسے طبی امداد دے سکتا تھا۔ اس کا خون بہنے سے روک سکتا تھا۔ اس کے لیے مدد لا سکتا تھا۔ لیکن میں۔۔۔ میں

نے چاہا تھا کہ وہ مر جائے۔ وہ وہاں گرا ہوا تھا۔ مر رہا تھا۔لیکن میری آنکھوں کے سامنے صرف تم تھیں ۔اس نے مجھے راستے میں کہا تھا کہ وہ ہرصورت یہ شادی رکوا کے رہے گا۔ وہ میرا راز سب کو بتائے گا پھرسب مجھ سے نفرت کریں گےتم بھی ۔اور یہ شادی نہیں ہوگی ۔تم سے میری محبت دیوانگی میں بدل چکی تھی ۔اور میں اپنا راز کھولے جانے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔اس لیے میں نے اسے مرنے دیا۔ نازی میں نے اسے مار دیا۔'' شارق کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ نازیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو شارق نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''نازی مجھے کہہ لینے دو۔ میں نے بہت سال اس اذیت میں گزارے ہیں ۔شروع کے کچھ سال میں اس واقعے کوتمہاری محبت میں جان بوجھ کرفراموش کئے رہا۔ میں نے تمہیں بھی اس کے ذکر سے منع کر دیا۔لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا احساسِ جرم بڑھتا چلا گیا۔ مجھے دن رات ایک ہی خیال رہنے لگا کہ میں قاتل ہوں ۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اس ویران جگہ پر مر جانے دیا اور کچھ نہیں کیا۔۔۔۔''
وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

''نازی مجھے معاف کر دو گی ؟۔۔۔نازی ممانی سے بھی کہو مجھے معاف کر دیں۔۔۔ میں کئی سالوں سے سخت اذیت میں ہوں ۔اپنے جرم کی سزا پا رہا ہوں ۔ مجھے معاف کردو،بس کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔''

''تم نے مارا۔۔۔ میرے بھائی کو۔۔۔میرے پیارے ندیم کوتم نے مار دیا۔اوراب تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو؟'' نازیہ پھوٹ پھوٹ کررودی۔شارق نے اس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن نازیہ نفرت سے جھٹک کر جانے لگی۔

''نازی تم مجھے قاتل کہہ لو لیکن مجھے معاف کر دو میں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ

برس، اپنے ضمیر کی جیل کاٹی ہے۔تم بس ایک لفظ معافی کا مجھے دے دو۔لیکن وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ پوری رات اس نے اسی کشمکش میں گزاری۔کس سے کہے؟ کیا کہے۔ماں کو بتائے جو پہلے ہی زندہ لاش کی صورت میں جی رہی ہے۔بچوں کو بتائے؟ جوان بیٹوں کو یہ دکھ دے کہ جس باپ کو وہ اپنا آئیڈئل مانتے ہیں وہ قاتل ہے۔اسی شش و پنج میں رات گزر گئی۔فجر کے وقت اسے خیال آیا کہ وہ کون سا ایسا راز تھا جس کے افشاً ہو جانے کے خوف سے شارق نے ندیم کو مر جانے دیا۔رات بھر میں وہ بہت کچھ سوچ چکی تھی اس لیے آہستہ روی سے چلتی ہوئی شارق کے کمرے کی طرف آئی۔اسے لگا کہ وہ جاگ رہا ہے اور آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا ہے۔" شارق! وہ کون سا راز تھا جس کے کھل جانے کے ڈر سے۔۔۔۔" اسے کوئی جواب نہ ملا۔نازیہ گھبرا کر اور قریب آئی تو دیکھا کہ شارق ہر قسم کے راز و نیاز سے نجات پا چکا تھا۔وہ اپنا ایک راز اسے دے کر ایک اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔نازیہ کو اپنی ماں اور بیٹوں کی خاطر اب یہ راز اپنے سینے میں ہی دفن کر لینا تھا۔

سید تحسین گیلانی

کیمیکل

ہم دوسری بار تسلی کے لیے ایک بار پھر چیک اپ کے لیے آئے تھے -لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی ! ہم دونوں کی شاید یہ آخری ملاقات تھی ۔ وہ میرے سامنے تھا، بھرپور مرد ،وجیہہ شخصیت کا مالک ،خوب رو گہری بھویں، پیشانی سے بھی ذرا آگے تک آئے ہوئے گہرے کالے بال ،کانوں کی لووں کو چھوتی ہوئی قلمیں، تیکھا ناک اور صاف رنگت کا مالک وہ شخص میرے سامنے ہی بیٹھا تھا جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے پانچ سال بتائے تھے -ہم دونوں کا جو تعلق دوستی سے شروع ہوا رشتے پر ختم ہو رہا تھا -اُس میں کیا کمی تھی، میں یہ بھی نہیں جانتی تھی لیکن مجھے اس سے تعلق نہیں رکھنا تھا -دیکھو تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ معلوم نہیں!!!

سننا چاہتے ہو تو سنو۔اب تمہاری خوشبو میں وہ خوشبو نہیں ہے جس کی میں دیوانی تھی -تم ہنستے ہو تو میرے اندر کوئی جھرنا نہیں پھوٹتا۔تم دور رہو تو مجھے تم بالکل بھی یاد نہیں آتے -تمہاری آواز کے دانت جب میرے جسم میں پیوست ہوتے ہیں تو میرے جسم سے لہو کی جگہ درد رستا ہے- الماری میں لٹکے ہوئے تمہارے کپڑے تمہاری غیر موجودگی میں آسیب بن کر اپنے خونخوار پنجے میرے ذہن کی رگوں میں گاڑتے ہیں اور میرے خیالوں کے چیتھڑے اڑاتے چلے جاتے ہیں-

تم ....تمہارا وجود مجھے کسی خوف ناک بلا سے بھی بدتر دکھائی دیتا ہے ایسی بلا جس نے میرے وجود کو ادھیڑ کر میرے ہی سامنے اسے دوبارہ سینا شروع کر دیا ہو-

اور....اور تمہارا خیال اگر بھولے سے بھی کبھی میرے سامنے جلوہ گر ہو جائے

تو میں اس پر نفرت کے اتنے وار کرتی ہوں کہ جب تک وہ چہرہ مسخ نہ ہو جائے میں مسلسل وار کیے جاتی ہوں۔

اور......کیا سوچتی ہو میرے بارے میں تم؟

کیا کبھی ہماری محبت ہمارا وہ جنون تمہیں یاد نہیں آیا؟

اگر وہ لمحہ مج※ ے کبھی مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں—اور۔۔اور۔۔ یاد رک※ ناوہ محبت یا جنون نہیں تھا وہ۔۔وہ تو پاگل پن ت※ ا جسم کی تڑپ تھی تم نے اپنے جسم کے لاحاصل وار کر کر کے میری روح کو زخموں سے اتنا چھلنی کیا ہے کہ میری سانسوں سے بھی لہو چھنتا ہے۔ تمہارے منہ سے یہ لفظ محبت کسی گندی نالی میں بہتے ہوئے شہد کی طرح لگ رہا ہے۔مت لو محبت کا نام—تم کیا جانو محبت کیا ہے۔محبت تو ایک ایسا احساس ہے جو بدن سے خوشبو بن کر پھوٹتا ہے محبت کا ایک ایک پل ایک ایک صدی پر بھاری ہوتا ہے۔

آہ محبت تمہاری تلاش میں یہ بدن کا صحرا نہ پڑتا تو شاید لوگ تجھ تک پہنچ ہی جاتے—لیکن تیرا تو مسکن مسافتوں میں گم ہو کر ہی رہ گیا۔

ہم تو انسانوں کے اس قبیلے سے ہیں جن کے رشتوں کو بدن کی ضرورت نے جوڑا ہوا ہے ورنہ یہ نظام کب کا رک گیا ہوتا۔انسان کب کا اپنی لاش پر بین کر چکا ہوتا۔

لیکن یہ بدن کے رشتے ب※ ی تو زندہ لاشیں ہی ہیں بس اتنے رحیم ضرور ہیں کہ یہ مردے ایک دوسرے کا بوجھ ڈھو رہے ہیں—دلوں کی جگہ کدورتیں دھڑکنیں بن چکی ہیں—تم مرد غلاظتوں کے چلتے پھرتے ڈھیر ہو جو اپنا دماغی تشنج عورتوں میں بانٹتے ہو—خود کو مطاہر و منور بنا کر دن بھر مسندوں پر عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے نعرے لگاتے ہو اور رات کا گھونگٹ اٹھاتے ہی روشنی پر ٹوٹ پڑتے ہو، کھاتے پیتے ہوئے تمھیں کچے اور پکے گوشت کا فرق بھی معلوم نہیں پڑتا—ظالم ہو تم....بلکہ ظلم بھی اگر تمہارا اصل چہرہ دیکھ لے تو اس کی

بھی نسیں پھٹ جائیں یہ عورت ہی ہے جو اس ظلم کی ڈولی میں بیٹھ کر اپنی ہستی کو جنازے میں بدل ڈالتی ہے۔ لیکن تم سن لو اب بس۔۔بس بس بس

دیکھو اس وقت شاید تم بہت خفا ہو رہی ہو، ہم پھر بات کریں گے۔ کئی دنوں سے دوا بھی نہیں کھائی!!

کس لیے کھاؤں میں دوا اور سنو۔۔ مجھے تم سے بات ہی نہیں کرنا۔ مجھے میرے پانچ سالوں کا حساب چاہیے جو تم نے برباد کیے تم ایک مصنفہ کے قاتل ہو تم نے اپنی عیاشی کے لیے اسے جیتے جی مار ڈالا۔ تم نے مجھ سے مجھے چھین لیا اور کیا دیا مجھے ان پانچ سالوں میں اداسی، تنہائی اور وہ راتوں کی دبی دبی چیخوں کے سوا کیا دیا مجھے تم نے جاؤ میرے قلم میں سکون کی وہ سیاہی بھر لاؤ کہ جس کی چمک آسمان پر بکھرے ان ستاروں سے بھی زیادہ تیز تھی جاؤ میرے ناولوں/ کہانیوں کے ہنستے مسکراتے ان کرداروں کے پاؤں پڑو اور ان کو واپس میرے ذہن کی دہلیز پر لے آؤ!!!

کر سکتے ہو یہ سب....

نہیں ناں تو جاؤ مجھے کوئی گڑیا ہی لا دو....

کچھ نہیں کر سکتے تم کچھ نہیں....

جب وہ وہ کرنے والا نہ کچھ کر سکا تو تم کیا کرو گے۔ وہ تو بس انسان کا تماشا دیکھ رہا ہے بلکہ انسان کا نہیں عورت کا، اسے بلند مقام دے کر اتنا گرا دیا کہ آج تک وہ مرد کے قدموں میں اپنی پہچان ڈھونڈ رہی ہے....واہ رے واہ!!!

میری آنکھوں میں غور سے دیکھو وہاں ایک اداسی کا جنگل ہے ذرا اس میں تو ایک پھیرا لگا کر آؤ...دیکھو اس جنگل بیاباں میں کتنی اداسیاں برہنہ پڑی ہیں۔ کتنی فریادیں اس گھنے جنگل میں دفن ہیں۔ کتنے خوابوں کی اجاڑ قبریں ہیں اس میں اور کتنی پامال حسرتوں نے

ڈیرے لگا رکھے ہیں وہاں ...لیکن تمھیں کیا تم مرد ہو پیسا بنانے والی ایک مشین، ظاہری ضرورتوں کے بیوپاری تم کیا جانو حسرتیں خواب اداسی کیا تمھیں تو صرف داسی کا ملن چاہئے قیمت چاہے اس کا خون ہی کیوں نہ ہو- دیکھو تم بول رہی ہو میں غور سے سن رہا ہوں لیکن تم میری وفا کو تو مت بھولو!!

یہ بھی خوب کہی تم نے وفا....اور مرد؟ میں قہقہہ ضرور لگاتی لیکن میں اپنے قہقہے بھی تم پر ضائع نہیں کروں گی- ہاں لیکن اگر وفا سیکھنی ہے تو کسی عورت کے دروازے پر مرد کو صدیوں ستاروں کی نیاز دینا گی تو شاید وفا کا ایک ذرہ مرد کو بھی بھیک میں مل ہی جائے- جاؤ علم و فکر کی ساری کتابیں چھان مارو...جاؤ تاریخ کی بھول بھلیاں سے ایک چکر لگا آؤ، ہر جگہ عورت تمھیں سراپا وفا ہی ملے گی... یاد رکھو میں کہانیوں میں دروازے توڑ کر بھاگتی عورت کی بات نہیں کر رہی وہ بھی تم جیسے مردوں کی پدری سوچ کے سوا کچھ نہیں ہے جن کے قلم کی زبان سے بھی جھوٹ ٹپکتا ہو وہ کیا وفا جانے-

تمہاری انھی باتوں کا تو میں دیوانہ ہوں ۔دیکھو ابھی کوئی فیصلہ مت کرو جلد بازی اچھی نہیں شاید تم سب سچ کہ رہی ہو لیکن میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتا ہوں، یہ بھی ایک سچ ہے ڈاکٹر صاحبہ کو آ لینے دو تب تک میری رہو-

سوری وہ نورین آپ ہیں!!

جی....جی ڈاکٹر صاحبہ

ہم معافی چاہتے ہیں پرانی رپورٹس غلط تھیں شاید کیمیکل میں کچھ مسئلہ تھا-

مبارک ہو آپ ماں بننے والی ہیں!!

صبا ممتاز بانو

آزادی

مٹی کے بنے ہوئے اس کچے گھر میں سب چیزیں معمولی تھیں۔ دَر و دیوار، برتن، بستر، حتیٰ کہ شیشے کا وہ گلاس بھی جس میں فاطمہ پانی پیتی تھی۔ اسے سٹیل کے گلاس میں پانی پینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے ابّے سے کہہ کر شیشے کا گلاس منگوایا تھا۔ سادہ سا شیشے کا گلاس اس وقت انتہائی قیمتی ہو جاتا جب فاطمہ کے ہونٹ اس کو چھوتے۔ ابھی کچھ سمے ہی تو بیتا تھا کہ فاطمہ کے گڑیوں سے کھیلنے کے دن گزرے تھے۔ جوں ہی بالی عمریا نے فاطمہ کے وجود پر دستک دی، خواب بن بلائے آنکھوں میں دَر آئے۔ لڑکیاں تو شاید پیدا ہی خواب دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ شباب کی منزل کو پہنچتے ہی ڈھیروں سپنے آنکھوں میں لیے خود کو سنوارتی، نکھارتی رہتی ہیں۔ آئینہ بھی مشاطہ بن کر ان کے جوبن کو چار چاند لگانے میں ان کا ساتھی، ہم راز اور دم ساز بن جاتا ہے۔ کبھی ہولے سے چھیڑ جاتا ہے اور کبھی کان میں ایسی سرگوشی کر جاتا ہے کہ اناروں کی رنگت والی دُنیاوی حوروں کے گال دہکنے لگتے ہیں۔ فاطمہ کا بھی یہی حال تھا۔ آئینے میں اپنا حسن دیکھتی تو دیکھتی رہ جاتی۔ شریر آئینہ اس کے حسن پر کوئی ایسا فقرہ کس دیتا کہ اس کی کان کی لوئیں سرخ ہو جاتیں اور تن من ایک ایسے نشے میں ڈوب جاتا جس میں مخموری اور سرشاری کا راج ہوتا۔ دودھیا رنگت، چشم غزالاں، ستواں ناک، صراحی دار گردن، یاقوتی ہونٹ، متناسب بدن اور اس پر سرو قد، ہاتھ ایسے کہ کسی اور کے ہاتھ لگیں تو میلے ہو جائیں، پاؤں ایسے کہ زمین پر پڑیں تو زمین خود کو نکھارنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ تو حور شمائل تھی، آسمان سے اُتری ہوئی حور، جو بھولے بھٹکے سے اس گھر میں پیدا

ہوگئی تھی جہاں کچھ بھی تو اس جیسا نہ تھا۔ وہ اپسرا تھی، دیوی تھی، مگر صرف اپنے خوابوں میں۔ حقیقت میں تو وہ فاطمہ تھی مولوی امین الدین کی اکلوتی بیٹی، جس کی ماں اسے جنم دیتے سمے دُنیا سے چلی گئی تھی۔ باپ نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے پائے، مگر کبھی کبھی فاطمہ کی غزالی آنکھوں میں اُداسی کے ڈورے تیرتے دیکھ کر وہ سمجھ جاتا کہ وہ اگر سمندر بھی بن جائے تو یہ پیاس نہیں بجھا سکتا۔ فاطمہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے وجود کے بڑے ہوتے ہی ختم ہوگئیں۔ اب تو بس ایک بات تھی کہ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ بچپن میں ایک دفعہ اپنی سہیلی رضیہ کے ساتھ اپنی گڑیا کو سجاتے ہوئے نہ جانے اس کے من میں کیا سوجھی کہ وہ اسے اندر بیٹھے ابا کے پاس لے گئی۔

''ابا......! دیکھو میری گڑیا بالکل میرے جیسی ہے ناں......! کیسی لگ رہی ہے ان کپڑوں میں......؟ یہ فراک رضیہ نے سیا ہے میری گڑیا کے لیے۔''

فاطمہ نے ابا کو گڑیا کا فراک دکھاتے ہوئے کہا۔

''بہت پیاری......! میری گڑیا جیسی ہے تیری گڑیا۔''

ابا نے اسے گود میں بٹھالیا۔

''اللہ نصیب اچھے کرے۔''

ابا نے دُعا دی۔ نصیب اچھا ہونا کسے کہتے ہیں......؟ اس بات کی سمجھ اسے تب آئی، جب یہ دُعا خود ہر نماز کے بعد اس کے لبوں سے نکلنے لگی۔ کیوں نہ نکلتی......؟ اس کا باپ اس کی شادی کے غم میں گھلا جا رہا تھا۔ اب وہ جوان ہوگئی تھی۔ بیٹی کی جوانی ماں باپ کی پریشانی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ گھر کا کام کرتے کرتے اتنے بڑے ہوگئے کہ اب اپنی کلائیاں سجانے کے لیے اسے سوا دو انچ کی چوڑیاں خریدنی پڑتی تھیں۔ ابا نے مسجد میں اذان دینی ہوتی تھی، وہ منہ اندھیرے اُٹھ جاتا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد وہ بھی نمازِ فجر ادا کرتی۔ ابا مسجد سے آتا تو وہ گرما گرم ناشتے کے ساتھ ابا کی منتظر ہوتی۔ گرم گرم پراٹھے، گھر کی دیسی مرغیوں کے انڈے، رضیہ کے گھر سے آئی ہوئی لسّی کے ساتھ خوب مزہ دیتے۔ فاطمہ کا جو دل چاہتا، ابا اسے پکانے کے لیے لا دیتا۔ کبھی وہ کوئی فرمائش کرتی تو اللہ

دین کے جِنّ کی طرح غائب ہو جاتا اور تھوڑی دیر بعد اس کی من پسند چیز لے کر حاضر ہو جاتا۔ اس کا ابا تو فرشتہ تھا۔ کم بولنا، کم کھانا، کم سونا اور کم ہنسنا۔ فاطمہ اس کی آنکھوں کا نور تھی، اس کے دل کا سرور تھی، اس کا جینا مرنا سب فاطمہ کے لیے تھا۔ فاطمہ کا لڑکپن جوں ہی جوانی میں بدلا، مولوی امین الدین کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔ نہ ماں، نہ بھائی، نہ بہن اور نہ کوئی اور رشتے دار، اکیلا امین الدین اس ہیرے کی حفاظت کیسے کرتا......؟ اس کی ناگن جیسی جوانی پر کسے پہرے دار بٹھائے......؟ مسجد کی حفاظت کرتے کرتے گھر لُٹ گیا تو......؟ نمازیوں کو نماز کے لیے پکارتے پکارتے فاطمہ کی پکار دَب گئی تو......؟

''یارب......! فاطمہ کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بھیج دے۔ آمین......!''

چند دن سے چوہدریوں کے گھر سے نذر نیاز کی چیزیں بھی زیادہ آنے لگی تھیں۔ موسم کے پھل سوغاتوں کی صورت بھیجے جا رہے تھے۔ تحفے تحائف کی بڑھتی ہوئی تعداد نے مولوی امین الدین کے خدشات بڑھا دیئے تھے۔ فاطمہ بھلے بہت حسین تھی، مگر غریب تھی۔ امیر غریبوں کی عزت سے کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں، عزت رکھنے کے نہیں۔ مولوی امین الدین کے خدشے اسے ڈراتے رہتے تھے۔ بھلے وہ گاؤں کی مسجد کا امام تھا، سب اس کی عزت کرتے تھے، مگر مولوی بھی تو بندہ بشر ہے، اس کی بیٹی عورت ذات، مولوی کی بیٹی ہے تو کیا......؟ کوئی کعبہ تھوڑی ہے، کوئی مسجد تھوڑی ہے۔ جو جی میں آئے کر ڈالو، کہاں کا مولوی......؟ کدھر کا مولوی......؟ گاؤں کی اس مسجد کا امام جسے چوھدریوں نے ہی تو بنوایا تھا، پھر امام بھی تو انہوں نے ہی رکھا تھا، تنخواہ بھی تو وہی دیتے تھے۔ ان کے سامنے آنکھوں میں خون تو اُتر سکتا تھا، زبان شعلے نہیں اُگل سکتی تھی۔ جس کا کھاتے ہیں، اس کے سامنے کیا اور کیسے بولیں......؟ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تو سوچوں کی بستی میں گھومتے گھومتے دھیان غلام دین سے جا ٹکرایا۔ اس کے بچپن کا دوست غلام دین، اس کا بیٹا نیاز، فاطمہ سے دس سال بڑا تھا تو کیا......؟ شادی میں کیا چھوٹا، کیا بڑا......؟ مرد خاوند بن کر عورت کا سایہ بن جاتا ہے۔ مرد اس جھونپڑے کی طرح ہی کیوں نہ ہو جو خس و خاشاک کی سے بنا ہوتا ہے، عورت اس کی چھپر چھایا تلے بیٹھ کر بھی محفوظ ہو جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پتا

ہی نہیں چلا کہ کب فاطمہ کی آنکھ لگ گئی۔

''فاطمہ......! فاطمہ......!''

ابا کی آواز پر اس نے دروازہ کھولا۔ ابا اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ چچا غلام دین بھی تھا، ابے کا بچپن کا دوست، اس کا لنگوٹیا یار۔ کھانا کھانے کے بعد ابا نے اسے بلایا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ چچا غلام دین نے پانچ سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے لگا جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔ ہتھیلی جل اُٹھی۔

''یہ کوئی بدشگونی تھی کیا......؟''

کئی دنوں سے ابا کے منہ سے چچا غلام دین کا وِرد سن رہی تھی، آج راز کھل ہی گیا تھا۔

''کیسا تھا نیاز......؟ اسے کیا پتا تھا......؟''

اسے تو اپنے خوابوں کے شہزادے کا پتا تھا جس کے ابھی وہ سپنے ہی دیکھتی تھی، ابھی شہزادے کے آنے کی عمر بھی تھوڑی تھی، ابھی تو سپنے دیکھنے کی عمر تھی، ابھی تو عمر کی مالا میں اس نے سپنوں کا پہلا دانا پرویا تھا، ایک ایک دانا کر کے مالا پوری ہو جاتی تو سفید گھوڑے پر چاند جیسا شہزادہ اسے لے جانے کے لیے آ جاتا۔

''یہ اتنی جلدی جو آ گیا، یہ شہزادہ تھا یا کوئی دیو......؟''

ابھی تو رتجگے کا موسم آنا تھا۔ ابھی تو بدن نے خوشبو سے مہکنا تھا اور ابے نے اس کا نکاح رکھ دیا۔ لال جوڑا، لال چوڑیاں، مہندی اور آرٹی فیشل جیولری کا ایک سیٹ۔ یہ تھی اس کی بری جو دُلہا لے کر آیا تھا۔ دو نئی چارپائیاں، نیا بستر، نیا پنکھا، کچھ نئے برتن، چند جوڑے اور ایک ٹرنک، یہ تھا جہیز جو اس کے ساتھ جانا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کراتے ہوئے ابے نے فقط اتنا کہا۔

''میری بیٹی......! میری عزت کی لاج رکھ لینا۔ گھر بنانا بہت مشکل ہے اور گھر توڑنا بہت آسان۔ تو نے گھر بسا کر دکھانا ہے۔''

فاطمہ نے باپ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور اپنا سر جھکا دیا، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کا باپ دُنیا میں سر اُٹھا کر چلے۔ اس نے اسے مڈل تک پڑھوایا تھا۔ گاؤں میں ایک

ہی مڈل سکول تھا۔ مڈل کے بعد ساتھ والے قصبے میں جانا پڑتا۔ ابا کو یہ منظور نہیں تھا۔ تب بھی وہ باپ کی خوشی میں خوش ہوگئی تھی اور آج بھی اس نے باپ کی خوشی کے لیے اپنے جذبے قربان کر دیئے تھے۔

''جیسا بھی ہوگا، بابا کی طرح خیال رکھے گا، اس کی فرمائشوں کو پورا کرے گا اور......اور......''

وہ شرما دی۔ پھر اس سے آگے تو سوچا بھی نہیں گیا اس سے۔ اس نے تو یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی شادی اس طرح ہوگی۔ نہ بینڈ باجا، نہ بارات اور نہ باراتی، اتنی سادگی سے تو جنازہ بھی نہیں اُٹھتا تھا۔ چچا غلام دین، اس کی ساس رضیہ، اس کی نند زرینہ اور اس کا خاوند نیاز، چار افراد کا یہ ٹولا چار بجے اسے لینے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بچپن کی سہیلی رضیہ نے اس کے لمبے گھنے ریشمی بالوں کا جوڑا بنایا۔ اسے ہلکا ہلکا میک اَپ کیا۔ اس کی گوری گوری کلائیوں کو چوڑیوں سے سجایا۔ کانوں میں سنہری بندے اور گلے میں سنہری ہار پہنایا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی حور زمین پر اُتر آئی ہو۔ حسن ایسا کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور چاندنی شرما کر چاند کے پہلو میں چھپ جائے۔ رضیہ کو اس نے اپنی رُخصتی کے دن خاص طور پر اس کی سسرال سے بلایا تھا۔ رضیہ، فاطمہ کے سامنے کھڑی بس اس کو تکے جا رہی تھی۔ قدرت نے کوئی کمی بھی تو نہیں چھوڑی تھی اس میں۔ فاطمہ ایسی تصویر تھی جو ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ فاطمہ کی نگاہوں کے سامنے رضیہ کی شادی کا منظر لہرا گیا۔ باراتیوں کا ہجوم، بینڈ باجے کی مسحور کن دُھنیں، پٹاخوں کی ٹھاہ ٹھاہ۔ سامنے میدان میں پکنے والی دیگیں اور ان دیگوں میں پکتے ہوئے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو۔ کاجل سے بھری آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور ٹوٹے ہوئے سپنے آنکھوں میں کرچیاں بن کر چبھنے لگے۔ دل نے ایک سرد آہ بھری۔ باہر صحن سے اس کے باپ کی طمانیت بھری آواز آئی۔ وہ کسی کو پکار رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں......! میرا کیا ہے، میرا باپ تو خوش ہے ناں......! لڑکی ذات خوش ہو یا نہ ہو۔ اصل خوشی تو گھر والوں کی ہوتی ہے۔ میرے گھر والے تو بس میرا باپ ہے۔''

مولوی امین الدین مطمئن تھا اور یہ خوشی سے آگے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس نے

اپنی پھول سی بچی کو شکاریوں کے ہاتھوں شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔ مولوی امین الدین امانت کو اس کے اصل حق دار کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ اپنی سسرال پہنچ گئی۔ اس کی نند نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ سٹیل کے گلاس میں تازہ پانی اسے پینے کو دیا۔ گلاس دیکھتے ہی اس کے اندر کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ ایک گھونٹ لیا تو اچھو لگ گیا۔ کوٹھڑی میں اس کی رنگین نئی چارپائی بچھا دی گئی۔ نئی نویلی دُلہن کو نئی چارپائی کے نئے بستر پر لیٹنے کے لیے کہہ کر اس کی نند چلی گئی۔ آنکھ لگی نہیں تھی کہ اس کا دُلہا آ گیا۔ نیاز، سانولے سلونے، چھوٹے سے قد، طوطے جیسی ناک والے دُلہا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس سے دس برس بڑی عمر کے نیاز نے بغیر کسی راز و نیاز کے اس کا وجود پھاڑ کر رکھ دیا۔ نئی نویلی دُلہن کی سسکیاں پنکھے کے شور میں دب کر رہ گئیں اور سہانے سپنے اشکوں میں بہہ گئے جنھیں نیاز نے میٹھے درد کی سوغات سمجھا۔ منہ اندھیرے نیاز نے اسے جگا دیا۔

''فاطمہ......! فاطمہ......! اُٹھ ساتھ والی کوٹھریوں کے جاگنے سے پہلے اُٹھ کر نہا لے، ورنہ وہ ہڑدنگ مچ جائے گی کہ تجھ سے نہایا نہیں جائے گا۔''

اس نے سٹپٹا کر دیکھا۔ نیاز اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے تو سنا تھا کہ پہلی رات کی دُلہن کو جی بھر کر سونے دیا جاتا ہے، اتنی جلدی نہیں جگایا جاتا۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں جاگا تھا اور اس کے خاوند نے اسے جگا دیا تھا۔

''پتا نہیں اس نے چار حرف قرآن کے بھی پڑھے ہیں یا نہیں......؟''

اس کا دل پھر ٹوٹ گیا۔

''باپ نے بس اسے بوجھ سمجھ کر سر سے اُتار دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ نیاز اس اہل ہے بھی یا نہیں۔''

ملگجے اندھیرے میں نیاز نے اسے بیت الخلا کا راستہ دکھایا۔ اس کے چمکتے ہوئے دودھیا بدن کو نیاز نے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

''سونا ہے سوہنی......! سونا ہی لائے گی۔''

بس ایک رات اور اگلا دن اس نے نئی نویلی دُلہن کے روپ میں گزارا۔ تیسرے دن نیاز نے اسے پھر جلدی جگا دیا۔

"اُٹھ بھاگوان......! کام پر چلنے کی تیاری کر، تجھے کہا تو تھا کہ کل سے تجھے بھی میرے ساتھ بھٹے پر کام کرنا ہے اور تو ہے کہ گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔"

فاطمہ کو تو اُٹھنا ہی تھا، یہ اس کے مجازی خدا کا حکم تھا۔ تین دن تک تو سوگ بھی منایا جاتا ہے اور یہاں دیہاڑی ٹوٹنے کے ڈر سے اسے تیسرے دن ہی چلنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ ایک اور خواب ٹوٹ گیا، سکون سے زندگی بسر کرنے کا، ہنسنے کا، دل بہلانے کا اور شرمانے کا۔ اسے بھٹے پر نیاز کے ساتھ کام کرتے ہوئے مہینا ہو گیا تھا۔ ابا اس عرصے میں ایک بار اس سے ملنے آیا تھا۔

"بابا......! دیکھو تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ میں کچھ دن تمہارے پاس آ کر رہ جاؤں......؟ لگتا ہے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔"

فاطمہ، ابا کا زرد سا چہرہ دیکھ کر کانپ اُٹھی۔

"نہیں بیٹا......! بیٹیاں اپنے گھر ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ تم یہاں رہو، اب تمہارا یہی گھر ہے۔"

مولوی امین الدین نے آہستہ سے کہا کہ کہیں فاطمہ اس کی رُندھی ہوئی آواز نہ سن لے۔ اس کا دل چاہا۔ فاطمہ کو ساتھ لے جائے، لیکن وہ خود چراغ سحری تھا، اب بجھا کہ تب بجھا۔ فاطمہ کا کیا بنے گا......؟ چوہدریوں کے چہرے بھی بہت بھیانک تھے، کتنی مشکل سے انہوں نے فاطمہ کے اچانک نکاح کو مولوی امین کی بیماری کا عذر سمجھ کر قبول کیا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہاں اس کا خاوند تھا، سسر تھا، ساس تھی، دو چار لوگ تھے اسے دیکھنے کو۔ وہ محفوظ تو تھی۔ منہ اندھیرے فجر کے وقت اُٹھنا، ایک بجے تک بھٹے پر کام کرنا، پھر تھوڑا سا وقفہ، روٹی پانی، آرام اور پھر عصر سے مغرب تک پھر وہی کام۔ یہی تھی اب فاطمہ کی زندگی مگر نیاز کو پیسے تو آ رہے تھے۔ بھٹا مالک دو ماہ سے باہر کے ملک گیا ہوا تھا۔ نیاز کو بے چینی سے اسی کا انتظار تھا۔ بھٹے پر کام کرتے کرتے فاطمہ کے ہاتھ سخت ہوتے جا رہے

تھے۔ ملائمت کھوتی جا رہی تھی۔ نرم و نازک سا بدن تنکے کی طرح کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے روشن دِیے بجھ کر رہ گئے تھے۔ کام جتنا زیادہ تھا، خوراک اتنی ہی کم۔ زیادہ مشقت کر کے بھی اتنا ہی ملتا تھا جس میں صرف گزارہ ہوتا تھا۔ سفید دودھیا رنگت زردی میں بدلتی جا رہی تھی۔ کسی کو کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ اس کا سسر، اس کی ساس، اس کا خاوند ڈنگروں کی طرح دن رات لگے رہتے تھے۔ نسل در نسل چلنے والی غلامی ان کی گھٹی میں پڑ چکی تھی، چاکری اور جی حضوری کے بغیر وہ اُدھورے تھے۔ نسل در نسل چلنے والی غلامی کی طرح قرض بھی نسل در نسل چلا آ رہا تھا۔ پہلا قرض اتنا طویل ہوتا کہ دوسرا لینے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھے۔ بس ایک وہ خوش نہیں تھی، کیونکہ اس کا باپ ایک مسجد کا امام تھا، کوئی پتھیرا نہیں تھا۔ اس کے باپ کو عزت حاصل تھی اور ایک پتھیرے کی سب بے عزتی کرتے تھے۔ غلامی کی روایت پتھیروں کو ورثے میں ملتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ مگر اس کی روایت تو کچھ اور تھی، پڑھنے کی، لکھنے کی، پڑھانے کی، لکھانے کی اور سمجھانے کی۔

''بابا......! میرے ساتھ یہ کیسا ظلم کیا......؟ مجھے جیتے جی مار ڈالا......؟ کنوئیں میں دھکا دے دیتا، نہر میں کاٹ کر پھینک دیتا، مگر یوں تو نہ کرتا۔''

ہر رات کوئی نہ کوئی شکوہ اس کے دماغ میں سر اُٹھانے لگتا۔ صبح اسے سُلا کر وہ پھر اپنے خاوند کے ساتھ اینٹیں بنانے لگتی۔ اس کے ہاتھوں میں اب تیزی آتی جا رہی تھی۔ اس کی اینٹیں بنانے کی تعداد میں اب اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ نیاز یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔

''دیکھ فاطمہ......! قرض اُتر جائے گا ناں تو پھر اپنا گھر بنائیں گے، اچھا کھانا کھائیں گے، اچھے کپڑے پہنیں گے، اپنے بچوں کو بھی اپنے ساتھ کام پر لے آئیں گے۔''

"تو کیا انہیں پڑھائیں گے نہیں......؟ اَن پڑھ، جاہل رکھیں گے......؟''

فاطمہ، نیاز کی بات سن کر خاموش نہ رہ سکی۔

''کتنے اچھے لگتے تھے اُجلے یونیفارم میں اُجلے اُجلے بچے۔''

اس نے سوچا کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائے گی اور نیاز انہیں اپنی طرح پتھیر بنانا چاہتا تھا۔

''پگلی......! کیا کرے گی انہیں پڑھا لکھا کر......؟ کرنا تو یہی کام ہے ناں......! پڑھ لکھ جائیں گے تو بھٹہ مالکوں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑیں گے۔ ان کے پاؤں نہیں دبائیں گے۔ پھر وہ یہ کوٹھری بھی ہم سے چھین لیں گے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔''

نیاز نے اتنی بڑی بات اتنی بے نیازی سے کہی کہ اس کا من جل کر رہ گیا۔

''نیاز......! اس معاملے میں میں تیری ایک نہیں ماننے والی۔ میں اپنے بچوں کو اس غلامی سے دُور لے جاؤں گی۔''

فاطمہ کے ارادوں میں چٹان جیسی سختی تھی۔

''اچھا اچھا......! وقت تو آنے دے۔ چل کام کر، خراب اینٹوں کے پیسے منشی کاٹ لے گا اور نقصان تو ہمارا ہی ہوا ناں......!''

نیاز نے بیوی کو غصے میں دیکھ کر خوشامد شروع کر دی۔ بھٹا کا مالک ملک رحمت علی وطن واپس آ گیا تھا اور آج کل میں بھٹے کا چکر لگانے والا تھا۔ نیاز کی آنکھوں میں بڑھتی ہوئی چمک کا بھٹا مالک کی واپسی سے کیا تعلق تھا، فاطمہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''آج کوئی اچھا سا سوٹ پہن لے اور تھوڑا سا سنگھار بھی کر لے۔''

شادی کو تین ماہ گزر گئے تھے اور نیاز نے پہلی دفعہ اس سے سولہ سنگھار کی بات کی تھی۔

''کیوں......؟''

فاطمہ نے پوچھا تو وہ ٹھٹک گیا۔

''ارے......! مالک نے آج بھٹے پر آنا ہے۔ اسے میری شادی کا بتا چکا ہے منشی۔ حاضری تو دینا ہوگی۔ تو بھی جائے گی۔''

نیاز نے پیار سے کہا۔

’’تو......تو اکیلا جا۔ میرا کیا کام......؟‘‘

فاطمہ نے تنک کر جواب دیا۔

’’پگلی ہو گئی ہے کیا......؟ مجھے تو وہ تب سے جانتا ہے، جب سے میں پیدا ہوا۔ نئی تو تُو آئی ہے۔‘‘

نیاز بولا۔ وہ کچھ سمجھی اور کچھ نہ سمجھی۔

’’شاید مالک کوئی دیالو آدمی تھا، ملازموں سے محبت کرنے والا۔‘‘

فاطمہ نے اپنے آپ سوچا۔

’’ہوں......! محبت کرنے والا ہوتا تو منشی یوں ظالموں کی طرح ہم سے کام لیتا......؟ روٹی بھی سکون سے کھانے نہیں دیتا۔‘‘

اپنے ہی سوال کا فاطمہ کے پاس جواب بھی تھا۔ کل آ گیا جس کا نیاز کو انتظار تھا اور فاطمہ کو تجسس۔

’’سن......! اسے سمجھا دیا ہے ناں کہ مالک کے کمرے میں کیسے جانا ہے......؟‘‘

اس کی ساس، نیاز کو کچھ کہہ رہی تھی۔

’’اماں......! یہ نہیں سمجھے گی، اسے جانے دے، بس......!‘‘

نیاز اور اس کی ساس کی باتیں فاطمہ کے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔

’’ارے......! کیا جانے دوں......؟ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے، میری ساس، میری ماں، اور پھر میں نے بھٹا مالک کو خوش کیا تھا۔ مالک خوش ہو گیا تو سکھ ہے، ورنہ......‘‘

اس کی ساس کے لہجے میں خوف تھا۔ الفاظ اس کے صحیح پلے نہیں پڑے۔ کھانے کے وقفے میں اس نے نیاز کے حکم پر کوٹھڑی میں پڑے ہوئے کپڑے اُٹھائے، نہا دھو کر وہ نیاز کے ساتھ چل دی۔ من میں کئی وسوسے سر اُٹھا رہے تھے۔ مالک پچپن برس کی عمر کا ایک تنومند آدمی تھا۔ چہرے سے ٹپکتی خباثت اور آنکھوں سے جھلکتی ہوس۔ فاطمہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

''یہ ہیرا ان پتھروں کے گھر۔''

قسمت کی خرابی نے اسے پتھروں میں لا پھینکا تھا۔

''ارے......! مجھے پتا ہوتا کہ تیری لگائی اتنی خوب صورت ہے تو اسے پہلی سلامی دینے کے لیے میں امریکہ سے دوڑا آتا۔''

ملک رحمت نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ملک رحمت کی بات سن کر فاطمہ کا سانس پھنسنے لگا۔ اس نے نیاز کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چل......! یہاں سے چل۔''

وہ نیاز کی طرف دیکھ کر بولے جا رہی تھی۔

''نیاز......! جا تو ذرا منشی کو بلا لا اور باہر سے عذرا کو بھیج۔''

مالک کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر نیاز اُٹھ گیا۔ نیاز دو منٹ کا کہہ کر گیا تھا۔ اب پانچ منٹ ہو گئے تھے۔ مالک رحمت علی بھی اپنی خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ عذرا ایک ادھیڑ عمر، صحت مند، ہٹی کٹی عورت تھی۔ اس نے آتے ہی فاطمہ کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

''چل میرے پیچھے پیچھے آ......! ابھی تھوڑی دیر تک تم گھر چلی جاؤ گی۔ گھبراؤ مت......!''

اس کے نرم الفاظ نے فاطمہ کو حوصلہ دیا۔ ایک شاندار کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لے کر کمرے میں داخل ہو گئی اور پھر اسے پہنچا کر اتنی ہی تیزی سے باہر بھی نکل گئی۔

''لڑکی......! تو خوش قسمت ہے کہ پورے کپڑوں میں اس کمرے تک پہنچی ہے، ورنہ اس کمرے میں ننگے بدن ہی نذرانے میں پیش کئے جاتے ہیں۔ نذرانہ اگر پسند آ جائے تو پھر طلبی کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ تم تو سولہ سال کی نوخیز کلی ہو۔ ابھی تو کئی برس اس پھول سے رَس چوسا جا سکتا ہے۔ تیری قسمت اچھی تھی کہ میں امریکہ سے باہر تھا، ورنہ ہمارے پتھیروں کی لگائیاں بطور نذرانہ پہلی رات ہمیں پیش کی جاتی ہیں۔''

دادرسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ دلسوزی کی دُنیا آباد تھی۔ رحم پتھروں سے ٹکرا رہا

تھا۔ حوا ذات کی آدم ذات ایک بھی نہیں سن رہا تھا۔ ملک رحمت کے دل سے رحم رُخصت ہو چکا تھا۔ اس کی دسترس سے نکلنے کی کوشش میں فاطمہ کی چیخیں کمرے میں گونج کر رہ گئیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی سی غنودگی چھانے لگی۔ عذرا نے شربت میں اسے کچھ پلایا تھا شاید۔ گرم ہونٹوں کا نرم ہونٹوں سے ملاپ جاری تھا۔ فاطمہ کا حال ایسے تھا جیسے کسی درندے نے انسان کو دبوچ رکھا ہو اور وہ اس سے نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہو کر خود کو موت کے سپرد کر بیٹھا ہو، یا جیسے کوئی پرندہ جال سے نکلنے کی کوشش میں خود کو لہولہان کر لے۔ اس کا انگ انگ ملک رحمت کے بوسوں سے ناپاک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا بھاری وجود اس کے ناتواں جسم سے جان نکال رہا تھا اور وہ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔ ملک رحمت کے بازوؤں کے گھیرے میں تحفظ فراہم کرنے والے بازو یاد آئے۔

''نیاز کا کام میری حفاظت کرنا تھا، اسی نے مجھے پیش کر دیا......؟''

سوچیں اس کو پاگل کیے دے رہی تھیں۔ اس کے بدن کے سب راز کھل چکے تھے۔ ملک رحمت اس دریافت پر عقابی پرواز اُڑ رہا تھا۔

''بڑا سرور ہے تجھ میں۔ ایسا لگتا ہے کہ نیاز کے قریب نہیں جاتی تو۔ بالکل اَن چھوئی جیسی ہے۔ فکر نہ کر، اب تیرے بچہ بھی ہو جائے گا۔''

اس کے لہجے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

''اس بستی کے اکثر بچوں کے باپ کوئی اور ہوتے ہیں، کہلاتے کوئی اور ہیں۔''

اس کے اندر کی میل ابل ابل کر باہر آ رہی تھی۔ وہ بے بسی کی اونچی مچان پر بیٹھی غصے سے ہونٹ کاٹتی ہوئی اس پلید کا لمس نکال رہی تھی۔ بابا نے اسے اِدھر اُدھر کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی شادی کی تھی۔ مگر یہ ہاتھ کدھر کے تھے......؟

''نیاز......! تو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میرے باپ نے تو مجھے مقدس صحیفے کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ کسی غیر مرد کی ہوا تک بھی نہیں لگنے دی تھی۔ تو نے تو مجھے پامال ہی کر دیا۔''

فاطمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''فاطو......! زندگی رونے کے لیے نہیں، لطف اُٹھانے کے لیے ہے۔ حسن کو برتا نہ جائے تو اس کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ خرچ کرنے سے اور نکھرتا ہے۔ ارے......! تیرا کیا گیا......؟ کچھ گیا......؟ بتا ناں......! ابھی تو یہاں سے جائے گی ناں تو تیرے پیچھے سال بھر کی گندم، چاول اور موسم کی فصل کا پہلا پھل پہنچ جائے گا۔ مفت کا سودا......! بس کر رونا دھونا۔''

ایک خبیث کے لہجے میں سودے کا سواد بول رہا تھا۔

''میرا نام فاطمہ ہے۔ میری عزت کو برباد کیا ہے تو نے۔ اب میرے نام کو بھی ذلیل کر رہا ہے۔''

فاطمہ نے روتے ہوئے کہا۔

''ارے......! فاطمہ، زینب، زرینہ، کمیوں کو یہ نام اچھے نہیں لگتے۔ فاطو، زینو، جینا، بگڑے ہوئے نام ہی کمی ذات کو سجتے ہیں۔''

اس نے اس کی بات پر اسے اس کی اوقات یاد دلائی۔ آج اس کا نام بھی بدل گیا تھا۔ اس کے بابا نے اسے بتایا تھا کہ جب وہ پیدا ہونے والی تھی تو انہوں نے سوچا تھا کہ وہ نبیؐ کی بیٹی کے نام پر اپنی بیٹی کا نام رکھیں گے، فاطمہ۔ آج ایک درندے نے اس پاک نام کو بھی بدل دیا جو بڑے چاؤ سے اس کے ماں باپ نے رکھا تھا۔ لٹے پٹے وجود کو لیے وہ اس حویلی سے نکلی۔ وہ اپنے آپ سے ہی شرمندہ ہوتی ہوئی کوٹھڑی تک پہنچی۔ رات کو نیاز آیا۔ ایک لمحے کے لیے فاطمہ کی حالت دیکھ کر اسے دُکھ ہوا، پھر بے غیرتی کے انبار تلے دب گیا۔ گرم گرم دودھ کا پیالہ لے کر وہ فاطمہ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''فاطمہ......! اُٹھ دودھ پی لے، طاقت بحال ہو جائے گی، کچھ سکون بھی مل جائے گا۔''

نیاز نے اس کے نیم مردہ وجود کو ہلایا۔

''مجھے نہیں پینا، مجھے نہیں پینا، لے جا اور چلا جا، میری نظروں سے پرے ہو جا۔ ہاں......! فاطمہ مر گئی ہے، اب میں فاطو ہوں۔ میرا ناپاک وجود اب فاطمہ کہلانے کے لائق

نہیں۔''

آنسو اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔ زندگی موت جیسی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دے فاطمہ......! اچھا، تیرے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ گاؤں سے فون آیا تھا۔ صبح ہوتے ہی چلی جانا، اپنے ابا کا حال پوچھنے۔''

باپ کی طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی۔ اپنا درد بھول گیا، مگر رات کیسے کٹے گی......؟ رات کو تو کٹنا تھا، کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی اس نے اپنے کپڑے لیے اور باپ کے گھر جانے کے لیے بے چین ہو گئی۔

''میں یہاں نہیں آؤں گی، کبھی نہیں آؤں گی۔''

گدھے کو ہنکارتے ہوئے نیاز نے فاطمہ کو باتوں باتوں میں ہنسانے کی، اس کا دل لگانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ تو کسی مجسمے کی طرح خاموش تھی۔ اس کے ہونٹوں پر چپ کا قفل تھا اور آنکھوں میں درد کا طوفان۔ اس کے بابل کا گھر آنے ہی والا تھا کہ نیاز کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

''اچھا اچھا......! ہم آ رہے ہیں۔ فاطمہ میرے ساتھ ہی ہے۔ بس پہنچنے والے ہیں۔''

نیاز نے فون بند کر کے اس کے خزاں رسیدہ چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔

''مولوی صاحب آخری دموں پر ہیں، شاید تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔''

نیاز کے الفاظ تھے یا بم، فاطمہ پر قیامت ٹوٹ پڑی، مگر بدقسمت فاطمہ کو باپ کا جیتا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔ شاید اس کے پاک وجود کو رُخصت کرنے والے میں اس کے ناپاک وجود کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی، نہ وہ تن تھا، نہ وہ نام۔ تن لُٹ گیا تھا، نام چھوٹ گیا تھا، مگر باپ کے جانے کے بعد تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، سب لُٹ گیا تھا۔ آج وہ بالکل خالی ہاتھ ہو گئی تھی۔ ماں باپ کے مر جانے کے بعد بیٹیاں کہاں زندہ رہتی ہیں......؟ بس نمائشی وجود کو لیے چلتی پھرتی رہتی ہیں۔ باپ کے گھر سے کبھی نہ آنے کا عہد کرنے والی فاطمہ کو پھر نیاز کے ساتھ آنا پڑا۔ مجبوریوں نے اسے وہ تمام سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیا، جن سے کبھی اسے شدید نفرت

تھی۔اب وہ بھٹا مالک کے ہاتھوں اپنی عزت کی دھجیاں اُڑواتے ہوئے چیختی نہیں تھی، بس سسکتی تھی اور سسک سسک کر جیتی تھی۔اسی سسکنے میں اور اسی جینے میں وہ دو بچوں کی ماں بن گئی۔بچے کس کے تھے، مالک کے یا نیاز کے، یہ تو فاطمہ کو بھی نہیں پتا تھا کہ کس کے تھے......؟ لیکن اسے اتنا پتا تھا کہ اس کے ضرور تھے۔ہر دوسری رات کسی دوسرے مرد کے ساتھ بستر پر گزارنے والی عورت کیا جانے کہ اس کے بچوں کا باپ کون ہے......؟ قرض اُتارتے اُتارتے فاطمہ کا حسن ڈھل رہا تھا، مگر قرض تھا کہ اُترتا ہی نہیں تھا۔اب ملک کا دل بھی اس سے بھرتا جا رہا تھا۔سال بھر کا راشن بھی اب نہیں ملتا تھا۔سرکاری ریٹ بھی پورا نہیں ملتا تھا۔ٹوٹی پھوٹی خراب اینٹوں کے پیسے الگ کاٹ لیے جاتے تھے۔کبھی کبھی سرکاری اہلکار آتے تو ان سے کہا جاتا کہ مالک کی کوئی شکایت ان سے نہیں کرنی ہے، جبری مشقت کی تو بات ہی نہیں کرنی، قرض کا تو ذکر بھی نہیں کرنا، بس مالک کی تعریف کرنی ہے۔دستورِ زبان بندی رائج تھا۔آج بھی کچھ سرکاری اہلکار آئے تھے۔مالک ابھی نہیں پہنچا تھا۔نیاز ان کے سامنے مالک کی تعریفیں کر رہا تھا۔

''مالک ہمارا بہت اچھا ہے جی......! وقت پر پیسے ملتے ہیں، مقررہ وقت سے زیادہ کام نہیں لیتا۔''

فاطمہ نے روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے ڈالتے اسے وہیں چھوڑا اور نیاز کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ایسے ہی جیسے بچپن میں وہ گڑیا کو لے کر اپنے باپ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس سے سوال داغ دیا تھا۔

''بابو......! قرض کی مد میں ہمارے پیسے ہر ہفتے کاٹ لیے جاتے ہیں۔یہ ایسا قرض ہے کہ جسے اُتارتے اُتارتے ہماری ہڈیاں بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں۔ہمارے جسموں کی طاقت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ہمارے بچے پڑھ نہیں سکتے۔مالک کہتا ہے، انہیں کام پر لگاؤ۔ہماری نسلیں ان کی خدمت کرتی ہیں۔اگر چون و چرا کریں تو بھٹہ مالک ہمیں آگے بیچ دیتے ہیں۔ہم وہ غلام ہیں جن کے آج بھی سودے ہوتے ہیں۔ہمیں یہی بتایا جاتا ہے کہ تمہیں فلاں کے پاس بیچ دیا گیا ہے۔غلامی کا رواج تو اب بھی ہے، تم کہتے ہو ختم ہو گیا۔بھٹا مالک

جوان ہوتی ہوئی کنواریوں کے جسم کا خراج مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم یہ سب اسی لیے سہہ رہے ہیں کہ ہمارے پاس نہ گھر ہے نہ گھاٹ، قرض اُترے گا تو گھر بنائیں گے۔‘‘

فاطمہ بولتی جارہی تھی، برسوں کا غبار نکل رہا تھا۔ نیاز تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"یہ فاطمہ نے کیا کیا......؟ ملک رحمت کو پتا چلا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔‘‘

نیاز کا خوف اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ ملک رحمت آیا تو سرکاری اہلکاروں کے لیے مرغ مسلم آچکا تھا۔ جانے سے پہلے ملک رحمت نے ان کی جیبیں بھر دی تھیں۔ اس لیے وہ خوش خوش گئے تھے۔ ملک رحمت سرکاری اہلکاروں کو ہمیشہ خوش کر کے بھیجتا تھا۔ فاطمہ سمجھی کہ سرکاری اہلکاروں نے ملک رحمت کو کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے اس نے نیاز اور فاطمہ کو نہیں بلایا، مگر یہ اس کی بھول تھی۔ انہوں نے کچھ نہ کچھ تو ملک رحمت کو بتایا تھا جو رات کو اسے حویلی میں آنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آج کمرے میں ملک رحمت نہیں تھا۔ وہ دو سرکاری ہرکارے تھے جن سے فاطمہ نے اپنا دُکھڑا رویا تھا۔ دونوں رات بھر اس کا جسم نوچتے رہے اور انسانیت کھڑے ہو کر تماشا دیکھتی رہی۔ سانسیں نوحہ کناں تھیں۔ وقت تیزی سے گزر جانا چاہتا تھا، مگر ظلم کی رات دُکھ کی رات کی طرح ہوتی ہے، طویل اور تکلیف دہ۔ اس کی آواز نے ماتم کی چادر اوڑھ لی تھی۔ جسم کے جنازے پر بین جاری تھا۔

’’روکھی سوکھی روٹی اور سر چھپانے کا ٹھکانہ...... اور بس......! اس کے لیے یہ خواری......؟ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔‘‘

فاطمہ نے اپنے بچوں کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا بوجھ بٹا رہے تھے۔ وہ اس قید سے نکلنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے سرکاری اہل کاروں کو سب بتانے کی ہمت کی تھی جس کا بدلہ اسے جسمانی اذیت کی صورت میں دیا گیا۔ مایوسی حد سے بڑھ چکی تھی۔ فاطمہ مرنا اور مار دینا چاہتی تھی۔ کیا اسے خود کو مار لینا چاہئے......؟ لیکن یہ بچے میرے ہی تو ہیں، ان کو بھی مار ڈالوں کیا......؟ ان کا دوش......؟

تخلیق تو داد پانے کے لیے ہوتی ہے۔ اسے بھٹا مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی نصرت یاد آئی۔ کبھی کبھی وہ تمام کوٹھڑیوں کا چکر لگاتی تھی اور انہیں بغاوت پر

اُکساتی تھی۔

''اپنے حقوق کے لیے اُٹھو۔ایسے تو مر جاؤ گے یا مار دیئے جاؤ گے۔''

نصرت کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''مجھے نصرت سے ملنا ہوگا۔نصرت اپنا کارڈ دے کر گئی تھی۔مجھے اس کے پاس جانا ہوگا۔اب میں یہ ظلم نہیں سہوں گی، مجھے اپنے بچوں کو پڑھانا لکھانا ہے۔انہیں نسل در نسل کی اس غلامی سے نکالنا ہے۔''

اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس قید سے نکل کر چھوڑے گی۔نیاز نے اسے بہت سمجھایا، مگر وہ نیاز کی ایک بھی سننے پر تیار نہیں تھی۔تنگ آ کر اس نے اسے روئی کی طرح دھنک دیا اور غصے میں باہر نکل گیا۔رات بھٹے پر سو گیا۔صبح ہونے سے پہلے ہی کوٹھڑی میں آیا تو فاطمہ نہیں تھی۔بچے سو رہے تھے۔چنگیر میں تازہ روٹیاں ڈھکی رکھی تھیں جو فاطمہ اس کے لیے اور بچوں کے لیے پکا کر گئی تھی۔نیاز کو اس پر بہت ترس آیا۔جاتے وقت بھی اسے ان کا خیال تھا۔

''یقیناً وہ نصرت کے پاس گئی ہوگی۔''

نصرت کا گھر ساتھ والے گاؤں میں تھا۔وہ عورت بھٹا مزدوروں کے لیے کام کرنے والی یونین میں کام کرتی تھی۔فاطمہ نے نصرت کو اپنے ساتھ بیتنے والے ظلم کی داستان سنائی۔اب وہ تھی، نصرت تھی اور سفر۔لاہور کے اس سفر میں وہ تمناؤں کی دُنیا بسا کر اور آشاؤں کو اپنے آنچل میں باندھ کر نصرت کے ساتھ روانہ ہوئی۔آج برسوں بعد اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔نصرت اسے این جی او کے دفتر لے گئی۔این جی او کے چیئرمین نے اسے یقین دلایا کہ اسے ملک رحمت کی قید سے رہائی مل جائے گی۔اس کا خاوند، اس کے بچے سب آزاد ہوں گے۔وہ جہاں مرضی چاہیں، جا سکیں گے، جو دل چاہے کر سکیں گے، اس کا کیس عدالت میں لگ گیا، سارے پیسے این جی او نے لگائے۔این جی او کے دفتر میں عارضی رہائش مل گئی تھی۔ابھی فاطمہ کو عدالت میں پیش ہو کر بیان دینا تھے۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں چھپائے گی۔آج فاطمہ کو این جی او کے مالک شان نے اپنے دفتر بلایا تھا۔فاطمہ کو کسی بھی وقت این جی او کے چیئرمین یا وکیل کا بلاوا آ

جاتا تھا۔اس کا کمرے میں رہنا بہتر تھا،اس لیے وہ بہت کم باہر نکلتی تھی۔ ویسے بھی یہ شہر اس کے لیے اجنبی تھا۔

''اب بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو......؟''

شان صاحب نے فاطمہ سے وہی سوال دُہرایا جس کا جواب وہ بارہا دے چکی تھی۔

''آزادی، آزادی فقط آزادی......! برسوں کی غلامی سے آزادی، اس محتاجی سے آزادی، جس میں ہم سب جی رہے ہیں،اس دیو کی قید سے آزادی جس نے میرے جسم کو داغدار کر دیا ہے۔ یہ کون سی زندگی ہے بابو......! جو ہم گزار رہے ہیں......؟''

''فاطمہ......! تم ٹھیک کہتی ہو،لیکن تم جینا کس کو کہتی ہو......؟ وہ کالا بڈھا مالک تھا ہی اس لائق کہ تم اس پر تھوکو،مگر کوئی خوب صورت، جوان، امیر آدمی اگر تمہارے ساتھ قربت کے کچھ لمحات گزارنا چاہے،تو اس سے بڑھ کر تمہیں کچھ اور اچھا نہیں لگے گا۔ زندگی حسین آدمی کے ساتھ سے حسین ہوتی ہے، حسین ہی حسن کی قدر کرنا جانتا ہے۔ ہیرے کی پرکھ ہر آدمی نہیں کر سکتا۔''

شان باتیں کرتے کرتے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم بہت اچھی ہو، بہت پیاری ہو،خوب صورت اور ذہین عورت کو کوئی مرد بہن نہیں بناتا، بیٹی نہیں سمجھتا،بس عورت سمجھتا ہے۔ میرے لیے بھی تم ایک عورت ہو،بس ایک عورت۔تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات......؟''

ایک وجود اسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے ہر حربہ آزما رہا تھا۔اس کا احتجاج کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرا کر دم توڑ گیا۔اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔اس این جی او کے دفتر سے بھی بھاگ جائے،مگر ایک اُمید۔۔۔۔۔

''آزادی......!''

''ہاں آزادی......!''

اس نے چپ سادھ لی۔کیس کی پیش رفت جاری تھی۔آج وکیل نے اسے اپنے

دفتر میں بلایا تھا۔ وکیل کا دفتر نیم ویران علاقے میں تھا۔ پوش ایریا کے مکین انسانوں کے ہجوم پسند نہیں کرتے۔ انسانوں کی رونق تو بستیوں، گاؤں اور محلوں میں ہوا کرتی ہے۔ پوش علاقوں میں رہنے والے تو مرد ہوتے ہیں یا عورتیں۔ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر وہ تیسرے فلور پر بنے اس دفتر میں پہنچ گئی۔ کمرہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وکیل کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''آؤ آؤ......! فاطمہ......! ڈرو مت۔ آ جاؤ......! بجلی گئی ہوئی ہے۔ یو پی ایس کام نہیں کر رہا۔ ٹھہرو میں ٹارچ لے کر آتا ہوں۔''

وکیل صاحب نے موبائل کی روشنی میں اسے دفتر کے اندر بنے ہوئے ایک چھوٹے کیبن نما کمرے کا راستہ دکھایا۔ فاطمہ کرسی پر بیٹھ گئی تو وکیل صاحب بھی اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئے۔

''اب بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا کیا ہوا......؟''

وکیل کی ڈھارس پر اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور زبان چلنے لگی۔

''اچھا بی بی......! اب یہ بھٹا مزدوروں پر ہوئے ظلم چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ پہلی بار ملک رحمت نے کب اور کیسے تمہاری عزت لوٹی......؟''

''عزت کیسے لوٹی جاتی ہے وکیل صاحب......! اور یہ کیسے لٹتی ہے......؟''

فاطمہ حیران تھی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے......؟

''وکیل صاحب......! جب عزت روز ہی لوٹی جانے لگے تو پھر کوئی دن پہلا نہیں رہتا۔''

فاطمہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''اچھا چلو......! تمہیں بھول گیا ہے شاید، میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔''

وکیل نے کرسی سے اُٹھ کر اسے شانوں سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ......؟''

فاطمہ چلاّئی۔

''کچھ نہیں......! تمہیں یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وکیل صاحب کی دست درازی فاطمہ کی آواز سن کر رُک گئی۔

''چھوڑو سب کچھ، شہر میں رہ جاؤ۔ سارا خرچا اُٹھاؤں گا۔ ہاں......! بیوی نہیں بنا سکوں گا، باقی سب ناز اُٹھاؤں گا۔ یہ شہروالیاں ایک کی تو ہوتی نہیں ہیں۔ ان سے کیا دوستی لگانی......؟ پھر ان کے نخرے کون اُٹھائے......؟''

پھر وہی ہوا جو پھر نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ فاطمہ نے بے بسی سے سسکاری بھری۔

''آزادی کی قیمت اتنی بھاری بھی چکانی پڑ سکتی ہے۔''

اس نے یہ سوچ کر تو لاہور کا رُخ نہیں کیا تھا، مگر اب قیمت ادا کرنے کے بعد ہر طرف گنگا بہہ رہی تھی۔ سب کی زبانوں سے شہد ٹپک رہا تھا۔ این جی او کے چیئرمین نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اسے آزادی دلا کر رہے گا۔ وکیل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کیس جیت کر دکھائے گا۔ وہ ان ساری باتوں اور وعدوں کے بیچ میں کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ ''میں کہاں پر ہوں......؟''

بھٹا مالک کے خلاف کیس جاری رکھنے کے فیصلے پر جج صاحب نے مہر ثبت کر دی۔ ان کا قرضہ معاف کر دیا گیا۔ انہیں غلامی سے رہائی دے دی گئی۔ جج صاحب نے فاطمہ کی طرف دیکھا جس کے لب بول رہے تھے۔

''جج صاحب......! مجھے رہائی نہیں چاہیئے، مجھے آزادی نہیں چاہیئے، مجھے واپس جانا ہے، میں اپنا کیس واپس لیتی ہوں۔''

''کیوں بی بی......! اتنے سال کی جبری مشقت سے کیا تم تھکی نہیں ہو......؟ تم تو وہ بہادر عورت ہو جس نے نسل در نسل چلنے والے غلامی کے کشکول کو توڑا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔''

جج صاحب کا انداز ناصحانہ تھا۔

''نہیں جج صاحب......! وہاں تو ایک ملک رحمت تھا یہاں تو ملک رحمت کے لبادے میں کئی ہیں۔ وہاں ایک بھیڑیا تھا، یہاں کئی بھیڑیئے ہیں۔ وہاں مجھے کمی سمجھ کر بستر

پر گھسیٹا جاتا تھا اور یہاں مجبور اور اکیلی سمجھ کر روندا جاتا ہے۔ گاؤں ہو یا شہر، سارے مرد ایک جیسے ہیں، جن کے لیے پرائی عورت بس پکے ہوئے پھل کی طرح ہوتی ہے۔ میں کس کس سے خود کو بچاؤں گی......؟ بھیڑیوں کی بستی میں رہنا جنگل میں رہنے سے بہتر ہے۔ میں اپنی بستی میں جانا چاہتی ہوں۔''

فاطمہ کے آنسو اس کی داستانِ غم بتا رہے تھے۔

''فیصلے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ تم آزاد ہو، جہاں چاہے جا سکتی ہو۔ میرا مشورہ مانو تو اسی شہر میں کوئی مزدوری کر لو۔''

جج صاحب نے یہ کہہ کر قلم دان اُٹھا دیا۔ اب وہ تھی اور آزادی۔ شام کے سایے پھیل چکے تھے۔ این جی او والوں نے اپنے دفتر کے دروازے اس کے لیے بند کر دیئے تھے۔ وکیل سے بھی کسی قسم کی ہمدردی کی اُمید نہیں تھی۔ فاطمہ نے فرعونوں کے بھید کھول دیئے تھے۔ شیطانوں کو ننگا کر دیا تھا۔

''سب ایک جیسے ہیں، اِدھر بھی، اُدھر بھی۔ ہم غلام ہیں، گاؤں کے مالک کے بھی اور شہر کے مکینوں کے بھی۔ اس کوٹھڑی میں پناہ تو تھی۔ ان بڑے بڑے شہروں میں تو کوئی جائے پناہ بھی نہیں۔ میرے بچے، ان کا کیا ہوگا......؟''

فاطمہ کو یہ بات بڑی دیر میں سمجھ آئی تھی، جسے نیاز نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ آشائیں فضا میں بھاگتی پھر رہی تھیں۔ وہ ان کو پکڑنے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس کے پاؤں نے آزادی کے راستے کو ٹھوکر مار دی تھی۔ من مندر میں گھنٹیاں بجنا بند ہو چکی تھیں۔

''مالک......! یہ بہک گئی تھی، اسے معاف کر دو۔''

نیاز نے بھٹا مالک کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے گردن ہلا کر بڑا پن دکھا دیا۔ نیاز نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ فاطمہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ آزادی کی تلاش میں سرگرداں خوار جسم کو بستر پر لٹا کر اس نے آنکھیں موندھ لیں۔

......O......

خاور چودھری

بے چہرگی

یہ جسموں کو چیرتی ہوئی سرد رُتوں کی صبح تھی۔ رات بارش بھی کچھ زیادہ ہی شدت سے ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مری کی پہاڑیوں پر اُترنے والی برف بہ کر اسلام آباد کی گلیوں میں آ گئی ہو یا پھر دیوسائی کا کوئی ستون ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا ہو۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی اور پوش ایریا میں اِکا دُکا شخص ہی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے ایک دوست کی عیادت کے لیے جانا تھا۔ کچھ دن پہلے اچانک اُس کے سینے میں درد نے کروٹ لی اور اتنی شدید کہ اُس کے گھر والوں نے خیال کیا؛ اب گیا، تب گیا۔ پھر مقامی سی ایم ایچ اسے منتقل کر دیا گیا۔ اب وہ شفا انٹرنیشنل سے علاج کروانے کے بعد اپنے اسلام آباد والے بنگلے میں مقیم تھا۔

منھ اندھیرے مجھے اس لیے آنا پڑا کہ اُسے آٹھ بجے اپنے گاؤں کے لیے نکلنا تھا اور میری بے پناہ مصروفیات مجھے پانچ سو کلومیٹر کا سفر کرنے سے روکتی تھیں۔ میں نے رات ہی اُسے فون پر اطلاع دے دی تھی کہ ناشتا اُس کے ساتھ کروں گا۔ ابھی میں اپنی سیاہ چمکتی ہوئی گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ سُرخ برساتی میں لپٹا ہوا ایک موٹر سائیکل سوار میرے شفاف کپڑوں پر تجریدی آرٹ بناتا ہوا زن سے گزر گیا۔ غصے نے اس قدر بے حال کیا کہ میں نے فوراً گاڑی اُس کے پیچھے دوڑائی اور سیونتھ ایونیو کے پاس اُسے جا لیا۔ اب وہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ سردی کی شدت نے اسے ہیلمٹ کے اندر بھی اپنا منھ چھپانے پر مجبور کر رکھا تھا اور بارش کے

یخ بستہ قطرے ہیلمٹ کا سینہ چیرتے ہوئے اُس کے نتھنوں پر چمک رہے تھے۔

میں نے اُس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو اُس نے برق رفتاری سے میری کلائی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اب میرے لیے حیرتوں کا سماں تھا کہ بہ ظاہر ایک دُبلا سا لڑکا اس قدر جی دار بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے دوسری ہتھیلی اُس کی کلائی پر جمائی اور قدرے شدت سے جھٹکا دے کر اُس کا ہاتھ اپنی کلائی سے الگ کر لیا۔ اب میرے لیے مزید حیرتوں کے در وا ہوئے۔ نوجوان کی کلائی میں کانچ کی ہری، پیلی اور گلابی چوڑیاں جو کچھ دیر پہلے رقص کناں تھیں؛ اب ٹوٹ کر زمین پر بکھر چکی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی کلائی پر سُرخی کی کئی لکیر دوڑ گئیں۔ دفعتاً جو اُس کے منھ سے سسکی نکلی تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پھول ہوا میں سرسراتا ہو یا پھر پتوں کی پازیب بجی ہو۔ شاید وہ سہم گیا تھا اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مات کھا کر تڑپ رہا ہو۔ میں نے بہت تیزی دکھاتے ہوئے اُس کے سر سے ہیلمٹ جدا کیا تو میرے سامنے آسمانی اپسرا کا دمکتا ہوا چہرہ تھا۔ ترشا ہوا، نکھرا ہوا، شرم سے تپتا ہوا۔ میری ساری مردانگی ہوا ہو گئی اور غصہ ایک طرف دھرا رہ گیا۔ مجھے اپنے شفاف کپڑوں پر پڑی ہوئی چھینٹوں سے کہیں زیادہ اپنے دل و دماغ میں بکھری ہوئی گندگی نظر آئی۔ میری نگاہیں اُس کا سراپا چھونے کی بجائے میرے ہی قدموں کے گرد لپٹتی تھیں۔ میں نے جھکی نظروں سے اُسے مخاطب کر کے کہا:

''معافی چاہتا ہوں ______ شناخت ہو جاتی تو کبھی تعاقب نہ کرتا۔''

''اب معذرت خواہی کا کیا فائدہ ______؟ اور شناخت تو آپ کو اپنی بھی نہیں۔''

''میں شرمندہ ہوں۔''

''شرمندگی سے کیا حاصل ______؟''

''میرا ردِعمل فطری تھا۔ میں ایک دوست کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ اس حال میں اُس تک

جاتے ہوئے عجیب احساس ہو رہا ہے۔''

''لیکن مجھے آج تک میری ماں کے علاوہ کسی نے نہیں چھوا تھا ______ اور ______''

''میں نے کہا نا ______ شرمندہ ہوں۔''

''آپ نے میری روح کو بھی خجل اور ننگا کر دیا ہے۔''

''میں یوں نہیں چاہتا تھا۔''

''نہ چاہتے ہوں ______ مگر''

''بدلہ لے لیجیے۔''

''بدلہ ______ ہاں بدلہ ______ فتح مندی مبارک ہو۔''

''فتح مندی کیسی۔ں تو اپنے آپ میں مر گیا ہوں ______ میری روح نادم اور شکستہ ہے۔''

اس کے الفاظ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔نہیں معلوم کتنا وقت گزر را اور وہ کب مجھے غرقِ ندامت کر کے چلی گئی تھی۔بس دماغ کی تہوں میں یہی بات ٹھہر گئی تھی، کہ اُس نے مجھے شناخت کے جوہر سے تہی کہا ہے۔اور آج زمانوں بعد پھر مجھے ایسی ہی کیفیت کا سامنا تھا،لیکن ایک نئے منظر نامے میں۔

O

کچے رستے پر چلتے چلتے جب میں تھک گیا تو میں نے اُس سے پوچھا آخر تو مجھے کیا دکھانا چاہتا ہے۔کہنے لگا:

''میں تمھیں تم سے ملانے جا رہا ہوں؛ خاموشی سے میرے پیچھے آتے رہو۔''

میں بوجھل قدموں کے ساتھ خود کو گھسیٹتے ہوئے دوبارہ اپنے ٹوٹتے ارادوں کی پوٹلی اُٹھا کر چل پڑا۔میں نے سوچا نہ جانے ایسی کیا بات ہے جو یہ مجھ سے دفتر میں نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے خود پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا خواہ مخواہ اس بڈھے کھوسٹ کی باتوں میں آ گیا۔بھلا یہ بھی کوئی دانش

مندی ہے کہ اتنی سخت دھوپ میں اتنا طویل سفر پیدل کیا جائے۔ اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ مجھے اتنی دُور لے کر جائے گا تو کم از کم میں سواری کا بندوبست ہی کر لیتا۔ اس فضول شخص نے تو مجھے چلا چلا کے مار ہی دیا تھا۔

آسمان پر سورج اپنی حدت سے پگھل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے جلانے کے لیے ہی یہ سارا انتظام ہوا ہو۔ اس کی لہریں سر کے راستے پورے وجود میں یوں اُتر رہی تھیں، جیسے آرا لکڑی کا سینہ چیرتا چلا جاتا ہے اور آخر اُسے دولخت کر دیتا ہے۔ مجھے لگا کہ میں بھی دولخت ہو چکا ہوں اور اب کٹے وجود کو اپنے شل بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ہر بار ناکام ہو کر بکھر جاتا ہوں۔ اَب مجھ میں دَم نہیں رہا تھا۔ کچے رستے سے لپٹی ہوئی جھاڑیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سلسلہ اپنے دامن میں بہت سی کہانیاں چھپائے بیٹھا ہے۔ میں بھی اپنی کہانی اُس کے سپرد کرنے والا تھا۔ میں نے بڈھے کو دوبارہ پکارا وہ بغیر جواب دیے آگے بڑھتا رہا۔ میں نے پھر آواز دی اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب میں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پورا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دریا میں نہایا ہوں۔ دفعتاً تیز ہوائیں چلیں۔ کچے رستے پر پھیلی ہوئی ریت کا ناچ شروع ہوا۔ کبھی وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر مچلتی، تو کبھی کچھ بلند ہو جاتی۔ یوں جیسی کوئی ماہر نرتکی پورے سبھاؤ سے اپنے انداز ظاہر کرتی ہے۔ میرے دماغ کے مردہ خلیوں کے اندر کوئی چیز سرسرانے لگی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اُسے گرفت کر سکوں مگر ناکام ہوا۔ سرسراہٹ بڑھتی گئی بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔ میں خود کو بھول گیا تھا۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اُس نے ریت کو اپنی جھولی میں بھرا اور پل بھر میں لا کر میرے منھ پر ڈال دیا۔ اَب میرا چہرہ، میری آنکھیں اور میری سانسیں گرد گرد تھیں۔ میں پہلے سے زیادہ نڈھال ہو چکا تھا۔

میرے اندر کوئی صدا جاگی۔ میں نے غور کیا تو مجھ سے میری شناخت پوچھی جا رہی تھی۔ میں اُلجھ سا گیا، حیران تھا کہ میرا اندر بھی مجھ سے بے خبر ہے اور مجھے نہیں جانتا۔ دھول سے اَٹا چہرہ یوں ہو گیا جیسے خارش زدہ ہو یا پھر جذام نے آ لیا ہو۔ آنکھوں میں حیرت اُگ آئی ہو اور سانسوں میں آکسیجن کی بجائے زہر بھر گیا ہو جیسے ایک جھاڑی نے سرگوشی میں کہا:

''اپنا آپ مجھے سونپ دو، تمھاری شناخت مٹ چکی ہے۔ اَب تم زندہ نہیں ہو اور جو مر جائیں اُن کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔''

مجھے لگا جیسے میری وجود میں اچانک کسی نے بجلی بھر دی ہے۔ میں تیزی سے اُٹھا اور جھاڑی کو للکارتے ہوئے اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ____

''میں زندہ ہوں، ثابت و سالم ____ میرا ہنر زندہ ہے، میرا اندر اور باہر سلامت ہیں۔ میری شناخت کوئی نہیں چھین سکتا۔''

پر میری شناخت ____؟ اگر میں خود کو جانتا ہوں تو یہ بڈھا مجھے کس سے ملانے لے جا رہا ہے؟ وہ بہت دُور جا چکا تھا؛ شاید اُس نے پلٹ کر بھی دیکھا ہو۔ میں بھاگم بھاگ اُس تک جا پہنچا۔ میں نے شکوہ کیا کہ:

''وہاں جھاڑیاں مجھ سے لپٹ گئی تھیں اور مجھ سے میری شناخت چھیننا چاہتی تھیں مگر تم نہیں رُکے۔''

بڈھے نے میری طرف دیکھا اور کہا:

''تم بزدل ہو۔''

میں چیخا۔ ''نہیں! میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نے اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔''

اُس نے مجھے یوں گھورا جیسے کوئی وحشی جانور اپنے شکار کو گھورتا ہے؛ میں ڈر کر سہم سا گیا۔ وہ بھانپ گیا، کہنے لگا:

''ڈرو مت! ــــــــــ خاموشی سے میرے پیچھے چلتے رہو۔''

میری تنی گردن پھڑ پھڑاتے گئی ــــــــــ میرے وجود کی بجلی پھر مرگئی اور میں بجھتے قدموں کے ساتھ اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

O

یہ صدیوں پرانا قبرستان تھا۔اس کے سینے میں بہت سی کہانیاں دفن تھیں۔ کتنے ہی امیرزادے،نواب زادے،خان زادے،ملک زادے،راجپوت،چودھری اورسیدزادے اس کی خاک میں خاک ہو چکے تھے۔میرے دماغ میں ایک خیال نے پھر سرسراہٹ پیدا کر دی۔کیا یہاں ساری خاک مل کر ایک ہوجاتی ہے یا پھر ہر ایک خاک یہاں بھی اپنی جداگانہ شناخت رکھتی ہے؟ امیرزادہ خاک،خان زادہ خاک،سیدزادہ خاک ــــــــــ؟ میری سوچیں باہم برسرِپیکار تھیں؛بڈھے کی آواز گونجی:

''تمھاری تم سے ملاقات ہوئی یا نہیں ــــــــــ؟''

میں ششدر اُس کی طرف دیکھنے لگا ــــــــــ کہنے لگا:

''اُلجھتے کیوں ہو؟ دیکھو یہاں سب ایک ہی زمین کا پیوند ہیں؛سب خاک ہیں؛ سب کا تکبر اس خاک کا رزق ہو چکا ہے؛سب کی شناخت یہ مٹی ہے۔یہ ساری قبریں ہیں ،صرف قبریں۔یہاں کوئی امیرزادہ،سیدزادہ،ملک زادہ یا خان زادہ نہیں ہے۔''

مجھے بڈھے کی باتوں پر سخت غصہ آنے لگا تھا ــــــــــ شناخت نہ ہوتی تو یہ کتبے کیوں لگے ہوئے ہوتے؟ میں نے کچھ کتبے پڑھ کر اُسے سنائے اور فرق بتایا۔اُس کے قہقہے فضا میں بلند ہونا شروع ہوئے ــــــــــ وہ ریت کی طرح محوِرقص ہوگیا؛کبھی زمین پر لوٹ پوٹ ہوجاتا تو کبھی اُس کے پاؤں زمین سے اُٹھ کر فضا میں بلند ہونے لگتے۔وہ ناچتا رہا،ناچتا رہا اور اُس کے سارے منظر میری آنکھوں میں جمتے رہے۔میں نے بڑھ

کر اُسے روکا______جھنجھوڑا______اُس سے پوچھا:

''تم مجھے یہاں کیوں لائے تھے______؟ ملاؤ نا مجھے مجھ سے______''

بڈھے نے قدرے کر ختگی سے کہا:

''تم لوگ ظاہر میں گم ہو جانے والے ہو______تم سامنے کے منظر کو سب کچھ مانتے ہو______تمھارے دل و دماغ سوجھ سے عاری ہو چکے ہیں______تم سایوں کا تعاقب کرتے ہو اور اصل کو چھوڑ دیتے ہو۔ تم خود سے نہیں مل سکتے______نہیں مل سکتے۔''

اب مجھے اُس سے زیادہ خود پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے سوچا یہ میری سیدھی باتوں کو خود نہیں سمجھ رہا اور اُلٹا مجھے قصوروار ٹھہراتا ہے۔ میں ظاہر میں کہاں بھٹکا ہوا ہوں؟ میں کب اس بات کو مان رہا ہوں کہ سب خاک میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں بھی ہر ایک کی خاک الگ ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ گناہ گار اور زاہد کی خاک یکجا ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زانی اور متقی کی خاک آپس میں مل جائے؟ ایسا نہیں ہو سکتا______مالک نے ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ سب کی شناخت قائم رہے۔ گناہ گار اور متقی اپنے چہروں سے پہچانے جائیں۔ میں نے اپنی سوچوں کو الفاظ دے کر سب کچھ بڈھے سے کہہ دیا۔ اَب وہ قہقہے نہیں لگا رہا تھا بلکہ توجہ سے میری باتیں سُن رہا تھا۔ اُس نے سامنے سے آ کر مجھے کندھوں سے پکڑا اور کہا:

''تم خود سے مل سکتے ہو مگر اس کا راستہ بہت کڑا ہے۔ تمھیں عیش و آرام کی زندگی چھوڑنا ہوگی۔ صحراؤں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا ہوگا؛ سمندروں اور خلاؤں میں تیرنا ہوگا؛ آسمانوں اور زمینوں کے اندر اُترنا ہوگا۔ تم یا تو اپنی کٹیا میں بیٹھ کر مست ہو جاتے ہو یا پھر مکتبوں میں بیٹھ کر سب کچھ بھولنے لگتے ہو۔ کائنات وسیع ہے اور اس کی تسخیر تمھارے ذمے ہے۔ تم اس حکم کو بھول بیٹھے ہو۔ خود کو پہچانو اور ملو______اَب لوگ تمھیں تمھارے

گھر میں آ کر مار جاتے ہیں اور تم اسے اپنی ''عظیم فتح'' سمجھتے ہو۔ لوگ تمھارے منہ میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو تم کہتے ہو: ''دوبارہ ایسا ہوا تو نظرِ ثانی کریں گے۔'' تم اپنی شناخت قائم رکھ سکتے ہو مگر اس کے لیے تمھیں اپنی راکھ سے زندہ ہونے کا ہنر آزمانا پڑے گا۔''

جانے کیا کیا کچھ وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا______ مگر جب خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تو بدن ٹوٹنے جا رہا تھا۔ اسلام آباد کی وہ یخ بستہ صبح میرے اندر ایک بار پھر بیدار ہو چکی تھی۔ چیخ کر ٹوٹ جانے والی چوڑیوں کی خراشوں نے ہتھیلیوں میں دوبارہ آگ بھر دی تھی۔

ڈاکٹر فیض قاضی آبادی

افسانچے

بے چاری ماں

وہ جب جوان تھی تو اپنے دو یتیم بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی۔ پھر جب وہ بوڑھی ہوگئی تب بھی اس نے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار دونو جوانوں کی ہر جائز ضرورت اور خواہش پوری کی۔

دونوں لڑکے ماں کی دعاوں کی برکت سے بڑے عہدوں پر تعینات ہو گئے۔ ایک کنیڈا میں سیٹل ہو گیا اور دوسرا سعودیہ میں۔

بوڑھی مر گئی!

دونوں لڑکوں نے تجہیز و تکفین پر خرچ ہوئی اپنے حصے کی رقم سپیڈ پوسٹ کے ذریعے مسجد کمیٹی کے صدر کے نام بھیج دی۔

امید

جب بستی میں سیلاب کا پانی داخل ہوا تو سب لوگ ضروری سامان ہاتھوں میں اٹھائے محفوظ جگہوں کی طرف جا رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں سیوٹ کیس تھا تو کسی کے ہاتھ میں کپڑوں کی گھٹری، کوئی بستر کو اپنے کندھے پر اٹھا کے جا رہا تھا تو کوئی برتنوں سے بھرا ہوا تھیلا۔ کچھ لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے جا رہے تھے تو کچھ دودھ دے رہی گائیں اور بکریوں کو۔ سرور جو ایک پیر سے لنگڑا تھا کو اپنے بوڑھے والدین سہارا دے کر

محفوظ جگہ کی طرف لے جا رہے تھے۔اُس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں اس کے میٹرک سے پوسٹ گریجویشن تک کی سرٹیفکیٹس تھیں۔یہ فائل اُس نے اپنے دائیں ہاتھ سے سینے کے ساتھ چمٹائے رکھی تھی۔اُس کے اوراایج (overage) ہونے میں ابھی چند مہینے باقی تھے۔

خشک سالی

پہلے سال پروفیسر صاحب نے اکرم کو اپنے پرچے میں نوے فیصد مارکس دیے۔اس سال کرم نے کشمیر سے اخروٹ، بادام، سیب، زعفران وغیرہ سب چیزیں ساتھ لے کر امتحان سے پہلے ہی پروفیسر صاحب کو دیے تھے۔دوسرے سال کے امتحان کا جب رزلٹ نکل آیا تو اکرم صرف چالیس فیصد مارکس سے پاس ہو گئے تھے۔اس سال کشمیر خشک سالی کی شکار ہو گئی تھی